# بے مثال

طالب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ سسپنس کے قارئین ان سے اور ان کی تحریروں سے بخوبی واقف ہیں بلکہ ان کی تحریروں کے شیدائی ہیں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ماہ طویل وقفے کے بعد ان کی ایک خوب صورت کہانی سے سسپنس کے آخری صفحات کی زیبائش کی گئی ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ قارئین اس کہانی کو ان صفحات میں بے حد پسند کریں گے۔ یہ ان لوگوں کی کہانی ہے جو عزت اور غیرت کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہیں۔ گو یہ لوگ پہاڑوں میں بستے ہیں اور ان کے سینے چٹانوں کی طرح فراخ اور مضبوط ہیں لیکن ان فراخ اور فولادی سینوں میں بڑے نرم اور بے حد گداز دل دھڑکتے ہیں۔ ان دلوں میں ہر جذبہ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ یہ آتش بداماں بھی ہیں اور گل بداماں بھی۔

اب شاہ بخت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال دودھ کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ کندھے جھک گئے۔ قویٰ اور اعصاب میں وہ پہلے جیسا دم خم نہیں رہا۔ چلتے ہوئے ٹانگیں کانپتی ہیں، بینائی بھی کمزور ہو گئی ہے اور آواز میں بھی وہ پہلے جیسی گھن گرج اب باقی نہیں۔ اس کی شان و شوکت اب قصۂ پارینہ بن چکی۔ اب تو وہ ایک تھکا ہوا آدمی ہے۔ زندگی کے بوجھ سے جس کی کمر میں خم آچکا ہے۔ اب وہ کہیں آتا جاتا بھی نہیں۔ زیادہ تر حویلی کے چھتی برآمدے میں بیٹھا رہتا ہے اور دور پہاڑوں پر چمکتی ہوئی برف کو دیکھتا رہتا ہے۔ وقفے وقفے سے ریشم حقہ تازہ کر دیتی ہے۔ وہ حقہ پیتا رہتا ہے اور گئے دنوں کو یاد کرتا رہتا ہے۔ فرصت ملنے پر ریشم بھی وہیں آ جاتی

ہے اور اُسے جیم آئے ہوئے اخبار پڑھ کر سناتی ہے ملک کے کیا
حالات ہیں، دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ دن یونہی تمام ہوتا ہے پھر اس کا
پوتا منزغام اسکول سے آ جاتا ہے۔ جس کی عمر چھ سات سال ہے۔ شام
کو باقی حصہ منزغام کے ساتھ کھیلنے اور باتیں کرنے میں گزر جاتا ہے اب
اُسے اور کسی بات سے کوئی بھی زیادہ دلچسپی نہیں۔ بس کی منزغام کے
ساتھ بچوں کی طرح کھیلنا اُسے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ اب منزغام

ہی اس کا سب کچھ ہے۔ اُس کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز۔ جو اس
کے نام کو زندہ رکھے گا اور خاندان کو آگے بڑھائے گا۔ منزغام اس کی
زندگی کے اندھیرے میں ایک روشن کرن کی طرح ہے۔ اس نے بہت
کچھ بلکہ بہت زیادہ کھو کر منزغام کو پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھ سات
سالہ منزغام اسے بہت زیادہ عزیز ہے۔ دنیا کی ہر شے سے زیادہ
اور وہ اپنے پوتے کی ذرا سی خوشی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ
اگر ضرورت پڑے تو، اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔

شاہ بخت کے ذہنی اور جسمانی انحطاط کا سبب عمر کے پیاسی برس
نہیں ہیں بلکہ حالات و واقعات کا وہ مدوجزر ہے جس میں اس نے زندگی
گزاری ہے جیسے نشیب و فراز اس نے پیاسی برسوں میں دیکھے ہیں شاید
ہی کسی نے دیکھے ہوں۔ جیسے المناک حادثوں سے وہ گزرا ہے دنیا
میں شاید ہی کسی کو اس کا تجربہ ہوا ہو۔ لوگ اگر اس کی کہانی سنیں تو
ممکن ہے یقین ہی نہ کریں۔ بھلا کہیں ایسا بھی ہوتا ہے۔ شاید نہ ہوتا
ہو مگر اس کے ساتھ تو ہوا۔ ہر چند کہ خود اسے بھی کبھی کبھی شبہ ہوتا
ہے کہ شاید اس نے ایک طویل اور ناقابل یقین سپنا دیکھا ہے خوفناک
اور آسیبی سپنا۔ اور شاید وہ اپنے اس شبے کو سچ ہی مان لیتا بشرطیکہ
دونوں قبریں موجود نہ ہوتیں۔ مگر دونوں قبریں موجود ہیں۔ خاندانی
قبرستان میں، جو قریب ہی واقع ہے اور وہ اور ریشم ہر ہفتے
وہاں جاتے ہیں۔ چراغ جلاتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ جب
تک وہ قبریں موجود ہیں، تب تک یہ حقیقت بھی زندہ رہے گی
کہ اس کی زندگی میں جو کچھ ہوا، وہ سپنا نہیں، سچ تھا۔

شاہ بخت اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کبھی کوئی بات
نہیں کرتا۔ فائدہ بھی کیا۔ اپنے ہی زخموں کو کریدنا کوئی آسان بات تو
نہیں تھی۔ اگر کبھی کوئی اُس سے بیتے دنوں کی بات کرنے کی
کوشش کرے بھی تو وہ فوراً ٹوک دیتا ہے۔ نہیں جو ہو گیا سو
ہو گیا۔ بھول جاؤ ان واقعات کو۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے کچھ حاصل
نہیں۔ آگے دیکھو زندگی ہمیشہ آگے بڑھتی ہے پیچھے نہیں لوٹتی
اور چونکہ لوگ شاہ بخت کو پسند کرتے ہیں، اس کے جذبات و احساسات
کا احترام کرتے ہیں، اس لیے کوئی بیتے دنوں کا ذکر چھیڑنے
کی کوشش نہیں کرتا۔ اور یوں شاہ بخت کی کہانی وقت کی گرد میں
چھپتی چلی گئی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاہ بخت خود بھی اپنی
کہانی کو بھول گیا ہے۔ وقت بے شک بہت بڑا مسیحا ہے لیکن
وقت نے شاہ بخت کو صرف صبر اور برداشت کی ہمت عطا کی
ہے۔ اُن زخموں کو نہیں بھرا جو اس کے دل اور روح پر لگے ہیں۔ یہ زخم
کبھی نہیں بھریں گے۔ ہمیشہ تازہ رہیں گے اور ان میں درد و کسک
کی ٹیسیں اٹھتی رہیں گی کیونکہ یہ زخم ایسے ہیں جنہیں مندمل کرنے
کے لیے وقت کے پاس کوئی مرہم نہیں ہے۔ اور شاہ بخت کو
وقت سے کوئی شکایت بھی نہیں۔ وہ تو خود بھی نہیں چاہتا کہ اس
کے زخم بھر جائیں۔ وہ ان چراغوں کو روشن رکھنا چاہتا ہے تاکہ ان
کی روشنی میں زندگی کا باقی ماندہ سفر طے کر سکے۔ ہاں بس اتنا ضرور
ہے کہ وہ اپنے زخموں کے بارے میں کسی سے کوئی گفتگو کرنا پسند
نہیں کرتا۔ یہ دولت وہ اپنے دل کے نہاں خانوں تک ہی محدود
رکھنا چاہتا ہے۔

اسے وہ شام آج بھی یاد ہے جب ریشم نے اس سے کہا تھا۔
"بابا جان! میں آپ کی شادی کروں گی۔"
شاہ بخت ہکا بکا رہ گیا تھا۔ یہ کیا ریشم نے کیا کہہ دیا!
عجیب بات ہے! اب بھلا وہ کیا شادی کرے گا۔ بے شک اس
کی بیوی کو مرے ہوئے چند سال ہو گئے ہیں اور تب سے وہ تنہا
ہے لیکن اسے تو کبھی شادی کا، یعنی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا۔
ایک تو یہ کہ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے دوم یہ کہ اُسے اپنی مرحوم
بیوی سے بہت محبت تھی اور وہ نہیں سمجھتا ہے کہ کوئی دوسری
عورت اس کی بیوی کی جگہ لے سکتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بیوی کی
رحلت کے وقت اس نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کبھی دوسری
شادی نہیں کرے گا۔ زندگی کا ایک حصہ اس نے بیوی کی رفاقت
میں گزارا ہے۔ باقی حصہ اس کی یاد میں گزارے گا اور وہ اپنے وعدے
پر قائم رہنا چاہتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ جتنی محبت اس نے اپنی
بیوی سے کی، ویسی محبت کسی اور عورت سے نہیں کر سکتا۔ تو پھر دوسری
شادی کا سوال ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ پھر ریشم نے اس سے ایسی بات کیوں کی؟
کتاب ماضی کا ایک اور ورق اُلٹتا ہے۔ اس ورق پر لکھی ہوئی
عبارت سے، ایک ایک لفظ سے، ایک ایک نقطے سے
شاہ بخت خوب واقف تھا اور اس ورق پر لکھی ہوئی عبارت
ہی نے دراصل ریشم کو اکسایا تھا کہ وہ شاہ بخت کے سامنے اس کی
دوسری شادی کی تجویز رکھے جب شاہ بخت حیرت کے گرداب
سے نکلا تو اس نے رٹ پٹاتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔
"ارے جانِ بابا! تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟"
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"
"نہ، نہ بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔" شاہ بخت ہنس پڑا۔
"کیوں نہیں، آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟"
"دیکھو بیٹا!" شاہ بخت نے نرم لہجے میں کہا۔ "شاید تمہیں ٹھیک
ٹھیک احساس نہیں ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"
"نہیں بابا جان! مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"
شاہ بخت تھوڑی دیر چپ رہا تھا اور غور سے ریشم کے
خوب صورت چہرے کو دیکھتا رہا تھا جس پر گہری سنجیدگی طاری اور

یقین کی جھلک تھی۔ جیسے اُسے واقعی معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔
پھر شاہ بخت نے ذرا سا افسردہ ہو کر کہا تھا: "جان بابا! تم عجیب بات کر رہی ہو۔ اس عمر میں میری شادی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ شادی تو تمہاری ہونی چاہیے۔"

ریشم شرما گئی تھی۔ مگر صرف ایک لمحے کو، پھر اس نے صاف اور قطعی لہجے میں کہا: "ضرور ہو گی بابا جان! ضرور ہو گی۔ مگر بعد میں۔ پہلے آپ کی شادی ہو گی۔"

"لیکن میں تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"کیوں نہیں؟ میں نے اس بات پر اچھی طرح غور کیا ہے اور بالکل فیصلہ کر چکی ہوں کہ آپ کی شادی ہو گی اور ضرور ہو گی۔"

شاہ بخت ایک بار پھر چونکا تھا اور تعجب سے ریشم کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے ریشم کی یہ ادا بھی اچھی لگی تھی۔ یہ اعتماد، یقین اور ارادے کی پختگی۔ یہ ریشم کا ایک ایسا روپ تھا جو پہلے اس کے علم میں نہیں آیا تھا۔ حالانکہ سردار شاہ بخت جیسے جاہ و جلال والا آدمی تھا۔ ایک بڑے قبیلے کا سردار تھا اور بے حد دولت مند، وہ خود سری اور بے لوثی کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا۔ گو وہ بے حد حلیم اور نرم خو بھی تھا لیکن یہ اس کی انتہائی پُرشکوہ شخصیت کا کمال تھا کہ لوگ خود بخود اُس کے سامنے مرعوب ہو جاتے تھے۔ قبیلے اور بستی میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اُس سے اونچی آواز میں بات کر سکے۔ لیکن ریشم نہ صرف اس سے اونچی آواز میں بات ہی کر رہی تھی، بلکہ اُسے مطلع کر رہی تھی کہ وہ شاہ بخت کی شادی کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کسی نے پہلے کبھی اس کی ذاتی زندگی اور نجی معاملات کے بارے میں فیصلے نہیں کیے تھے حتیٰ کہ اس کی مرحومہ بیوی نے بھی نہیں۔ ریشم پہلی لڑکی تھی جو نہ صرف فیصلہ کر چکی تھی بلکہ اُس کے لہجے میں حکم کا عنصر بھی جھلک رہا تھا۔ شاہ بخت کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ پھر بھی اُسے بُری نہیں لگی۔ بلکہ ایک خوشی سی ہوئی۔ یہ چاہت اور محبت کا انداز کبھی کبھی ایسے انداز میں ہو تو اچھا لگتا ہے۔ شاہ بخت تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہے ریشم! کہ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ کیا تم نے اس پر غور کیا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟"

"بابا جان!" ریشم نے نرمی سے کہا: "لوگوں کو نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ان میں اتنی ہمت ہے کہ وہ سردار شاہ بخت کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کریں۔"

"چلو مان لیا۔" شاہ بخت نے [illegible] سے کہا: "لیکن تم نے سوچا ہے کون عورت شادی کرے گی؟"

ریشم مسکرائی پھر بولی: "بابا جان! میں نے سب سوچ لیا ہے۔ میری سہیلی کی ایک سہیلی ہیں منور۔ آپ ایک بار ان سے مل چکے ہیں۔ بیوہ ہیں مگر بے حد نیک اور شریف۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی رفاقت پہنچنے میں فخر محسوس کریں گی۔"

شاہ بخت کو ایک بار پھر تعجب نے گھیر لیا: "کیا تم نے ان سے بات کر لی ہے؟"

"ابھی نہیں، لیکن کروں گی۔ پہلے آپ کی منظوری ضروری ہے۔"

"مگر..."

"بس بابا جان! باقی باتیں بعد میں۔ آپ دو تین دن اس پر غور کر لیں پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیجیے گا۔"

[illegible] خاموش بیٹھا رہا اور اُلجھی ہوئی نظروں سے ریشم کو دیکھتا رہا۔ جو [illegible] سے اندرونی کمرے کی جانب جا رہی تھی۔ سترہ سالہ ریشم کی چال [illegible] نہیں تھی بلکہ وہ بڑے اعتماد سے چل رہی تھی جیسے اسے ذہنی طور سے اپنے قدم جمانے کا ہنر آتا ہو۔ جب وہ کمرے میں غائب ہو گئی تو شاہ بخت نے طویل سانس لی اور خود سے کہا۔

"جان بابا! تم تو فیصلہ کر ہی چکی ہو۔ پھر میرے غور کرنے کی گنجائش کہاں ہے۔"

اس رات شاہ بخت کو نیند نہیں آئی۔ وہ سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ ریشم نے جو کچھ کہا تھا، وہ تو واضح تھا، لیکن ریشم [illegible] کیا تھی۔ اس تجویز کے پیچھے کون سی خواہش کار فرما تھی، یہ بات شاہ بخت کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ جتنا غور کرتا، اتنی ہی اُلجھن بڑھتی جاتی۔ شاہ بخت کے رشتے دار تو زیادہ نہیں تھے لیکن قبیلہ خاصا بڑا تھا اور قبیلے کے افراد اس کی پُرشکوہ حویلی کے اطراف میں اور بستی میں رہتے تھے جو حویلی سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھی۔ شاہ بخت جب سوچتا کہ اگر وہ ریشم کی بات مان لے تو قبیلے کے لوگ کیا کہیں گے۔ ممکن ہے زبان سے کچھ نہ کہیں، لیکن ان کے دلوں میں شاہ بخت کے لیے جو عزت و توقیر ہے، اس میں ضرور کمی ہو جائے گی۔ تو پھر آخر وہ کیا کرے۔ مشکل یہ ہے کہ ریشم کو کیسے سمجھائے۔ ریشم اُسے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی کوئی فرمائش، کوئی ضد وہ نہیں ٹال سکتا۔ اب اگر ریشم اس کی دوسری شادی کے لیے واقعی بضد ہو گئی تو وہ کیا کرے گا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ریشم نے ایسا سوچا کیوں؟

اگلی صبح ناشتے پر ریشم سے سامنا ہوا تو اس نے پھر شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"جان بابا! میں ساری رات اس بات پر غور کرتا رہا ہوں۔"

"تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

شاہ بخت نے قہوے کا ایک گھونٹ لیا۔ پھر ہنستے ہوئے ریشم سے کہا: "سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں، کیسے کہوں۔ تمہاری ضد سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ پھر بھی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھو بیٹا! میری عمر اب پچاس کے لگ بھگ ہے۔ اس عمر میں میں شادی کروں، یہ بالکل غیر مناسب ہو گا



شادی تو تمہاری ہونا ہے اور پچھلے کچھ دن سے میں اس پر غور کر رہا ہوں۔"

ریشم مگر چپ رہی۔ پھر طویل سانس لے کر بولی: "بابا جان! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آپ کا حکم نہیں ٹالوں گی۔ اگر آپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کروں گی لیکن..."

"لیکن کیا؟"

"لیکن میری شادی صرف آپ کے بیٹے سے ہو گی۔"

[illegible] بخت کو پھر ایک جھٹکا لگا۔ قہوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹتے بچی۔ اس نے حیران ہو کر ریشم کو دیکھا۔ یہ کیا ریشم نے کہہ دیا۔ کیا [illegible] ریشم کو ہو گیا ہے۔ کیسی عجیب، ناقابلِ فہم بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے۔ بھلا ریشم کی شادی اس کے بیٹے سے کیسے ہو [illegible] تو ایک ہی بیٹا تھا، فیروز گل۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ پھر ریشم کی اس بات کا کیا مطلب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تنہائی اور بیوگی کی اذیت نے اس کے دل و دماغ پر بُرا اثر ڈالا ہو۔ شاید یہی بات [illegible] نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر اپنے لہجے میں بے انتہا پیار اور محبت سمیٹ کر بولا۔

"جان بابا! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم تو جانتی ہو کہ..."

"ہاں! میں جانتی ہوں۔" ریشم نے گردن جھکا کر مدھم اور افسردہ آواز میں کہا: "اور میں یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ آپ کو میری باتیں بہت عجیب لگ رہی ہیں۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔ لیکن بابا جان! آپ کو وہ رات یاد ہے جب میرا سہاگ لُٹا تھا؟"

شاہ بخت نے پیالی نیچے رکھ دی اور یکایک آنکھیں بند کر لیں۔ یکایک اُسے ایسا لگا جیسے اس کا دل دو لخت ہو گیا ہے۔ ہاں، اُسے وہ رات یاد ہے جب اس کی زندگی میں ایک قیامت آئی تھی۔ جب ریشم بیوہ ہوئی تھی اور اس کا عصائے پیری اس کے ہاتھ سے چھن گیا تھا۔ اس رات کا [illegible] لمحہ آج بھی اس کے دل میں تازہ ہے۔ باریک، نوک دار، زہریلے کانٹوں کی طرح۔ اگر شاہ بخت چاہے بھی تو ان سوئیوں کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا۔ وہ رات اُسے یاد ہے اور یاد رہے گی اور پھر ابھی کچھ اتنے زیادہ دن بھی تو نہیں گزرے۔ صرف ایک سال پہلے کی تو بات ہے جب وہ قیامت اُن کے گھرانے سے خاندان کی تمام خوشیوں کو سیاہ پوش کر گئی تھی۔ شاہ بخت چپ چاپ آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا اور یاد کرتا رہا۔ ان تمام چراغوں کو جو حویلی میں جگمگاتے تھے اور شادی کے اُن تمام گیتوں کو جو حویلی میں گونجے تھے اور مبارک باد کے اُن تمام پیغامات کو جو اس نے مہمانوں سے وصول کیے تھے اور پھر اس جگر خراش چیخ کو جو ریشم کے لبوں سے

ہوئی تھی۔

شاہ بخت کی [illegible] ہو گیا تھا جب اس زندگی کا [illegible] شکار [illegible] وہ بہت [illegible] محبت نے [illegible] دین دار، لیکن یہ تھی [illegible] ہمیشہ [illegible] تھی [illegible] علاج [illegible] کرنے نہیں چھوڑیں قریب [illegible] اکثر ایسا [illegible] تھا ہیں۔ شاہ بخت کی بیوی کا [illegible] بیوی کو اس تعلق [illegible] کے لیے غیر [illegible] چاہتا تھا۔ مگر وقت نے مہلت نہ دی۔ ایک بار جو وہ بیمار [illegible] تو پھر [illegible] کی۔ یہ سارا شاہ بخت کے لیے [illegible] غم اور محرومی کا احساس نے اُسے چاروں طرف سے گھیر [illegible] شاید زندگی گزارنا اس کے لیے بے حد مشکل ہو جاتا لیکن اس [illegible] تھے جاتے اُسے خوب صورت اور انمول تحفہ دے گئی تھی۔ [illegible] جو اس وقت چھ سات سال کا تھا۔ بچے کی موجودگی نے [illegible] دکھوں پر کسی حد تک مرہم رکھ دیا۔ اور شاہ بخت نے اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر ایک بار پھر زندگی میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ رشتے داروں اور قبیلے کے چند بزرگوں نے اُسے دوسری شادی کا مشورہ دیا لیکن شاہ بخت نے انکار کر دیا۔

ایک تو اس لیے کہ وہ اپنے لختِ جگر پر سوتیلی ماں کا سایہ مسلط نہیں کرنا چاہتا تھا کیا پتا سوتیلی ماں اُسے سچی محبت دے سکے گی یا نہیں۔ دوسری وجہ تھی کہ بیوی کے انتقال کے وقت شاہ بخت نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ جس طرح وہ زندگی میں اپنی بیوی سے محبت کرتا رہا ہے اسی طرح اس کی موت کے بعد بھی کرتا رہے گا اور یہی وہ وجوہ تھیں جن کی وجہ سے اس نے دوسری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ خود ہی فیروز گل کی پرورش کی، اُسے باپ کا پیار بھی دیا اور ماں کی تربیت بھی۔ وقت دھیرے دھیرے گزرا حتیٰ کہ فیروز گل جوان ہو گیا اور تب شاہ بخت نے فیروز گل کی شادی کا فیصلہ کیا۔

بائیس سالہ فیروز گل بڑا وجیہ اور شاندار نوجوان تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچا قد، چوڑا سینہ، دودھ جیسا سفید رنگ، جوانی کے نشے میں ڈوبی ہوئی بڑی بڑی سنہری آنکھیں، گھونگریالے بال، ناک نقشہ ایسا تیکھا اور بے عیب جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے برسوں کی محنت اور ریاضت کے بعد تراشا ہو۔ بے حد دلیر اور شہ زور بھی تھا۔ اور چال تو اتنی پُروقار اور شاہانہ تھی کہ جدھر سے نکلتا تھا، لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔ [illegible] قبیلے کی ان گنت کنواریاں اس کے [illegible] آہیں بھرتی تھیں اور شاہ بخت ان میں سے کسی کو بھی فیروز گل کے لیے منتخب کر سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ کسی ایسی لڑکی کا انتخاب کرے جو حسن، شخصیت، علم اور کردار ہر اعتبار سے اس کے بیٹے کے ہم پلہ

جو بڑی کوشش کے بعد شاہ بخت کی نظر انتخاب ریشم پر پڑی جو قبیلے کے ایک غریب لیکن باعزت بزرگ کی بیٹی تھی۔ اس کی ماں [illegible] ہو چکا تھا، باپ نے ہی بیٹی کو پالا تھا۔ بستی کے مغرب میں آبادی سے قدرے فاصلے پر ان کی کچھ زمین تھی، وہیں ان کا مکان بھی تھا۔ زمین کی آمدنی بہرحال اتنی تھی کہ دونوں باپ بیٹی نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے بغیر عزت و آبرو سے زندگی گزاری تھی۔ ریشم بے حد حسین تھی، اتنی کہ جو بھی اسے ایک بار دیکھتا، دوسری بار دیکھنے کی آرزو میں ساری عمر گزار دیتا۔ چمکتا ہوا چاند، کھلا ہوا گلاب، [illegible] ہوا ہیرا، کوئی تشبیہ اس کے [illegible] والے حسن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی تھی۔ بے حد [illegible] گلابی رنگ، ہرنوں کی طرح دو وحشی آنکھیں، سروقد، سیاہ بال [illegible] چلتی تو لگتا بہاریں ہم قدم ہیں، مسکراتی تو [illegible] ہوتا۔ یہی نہیں وہ زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ تھی اور اخلاق و آداب میں بھی کوئی دوسری لڑکی اس کی برابری نہیں کر سکتی تھی۔ جب شاہ بخت نے اسے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ کمال ہے، آخر وہ [illegible] ایک لڑکی میں جمع ہو گئی ہیں۔ بس ٹھیک ہے، یہی لڑکی میرے فیروز گل کے لیے ٹھیک رہے گی۔ شاہ بخت نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے فیصلہ کیا۔

رشتے کے ایک بزرگ نے سُنا تو تعجب کا اظہار کیا: "بھئی شاہ بخت کیا تمہیں کوئی اور لڑکی نہیں ملی؟"

"کیا مطلب؟" شاہ بخت نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ قبیلے میں کئی صاحب حیثیت اور دولت مند لوگ موجود ہیں۔ پھر بھی [illegible] تم کسی دوسرے قبیلے میں بھی لڑکی دیکھ سکتے تھے؟"

"بے شک، لیکن اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ریشم بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"میں نے بھی اس لڑکی کی بہت تعریف سنی ہے۔" بزرگ نے کہا۔ "مگر بھئی اس کے والد تو خاصے غریب آدمی ہیں۔"

شاہ بخت ہنس دیا: "آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میرا نقطۂ نظر کچھ اور ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جن کے گھر میں ریشم جیسا ہیرا موجود ہو وہ غریب نہیں ہو سکتا۔ اسے تو امیر الامراء کہنا چاہیے۔"

"مگر...؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔" شاہ بخت نے نرمی سے جواب دیا۔ "دیکھیے مجھے دولت کی کوئی خواہش نہیں۔ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے میرے پاس۔ مجھے تو ایک ایسی بہو چاہیے جو اس حویلی کے وقار اور شان و شوکت میں اضافہ کرے اور میں جانتا ہوں کہ ریشم ایسی ہی لڑکی ہے۔ بخدا وہ اس حویلی کی عظمت کو چار چاند لگا دے گی، اس کا مجھے یقین ہے۔"

شاہ بخت [illegible] اور اس کے تصور میں یادوں کے دائرے بنتے رہے اور ٹوٹتے رہے۔ وہ دن یاد آیا جب

ٹیلی پیتھی موجودہ دور میں ٹیلی فون، وائرلیس، ریڈیو، مائکروویو سسٹم اور ٹیلی ویژن وغیرہ کی سی [illegible] شرح ہیں۔ ابھی بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ حیاتِ انسانی بھی ایک خودکار برقی نظام سے متحرک ہے اور انسان ذہن اور روح کی ان دیکھی برقی قوت سے عمل پیرا ہے۔ ٹیلی پیتھی بھی کوئی جادو کا علم نہیں بلکہ ایک نظام ہے۔ ایک سسٹم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان اپنے ذہن کو مطلوبہ انسان کے ذہن سے میلوں کی دوری پر بھی جوڑ سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک طاقتور ٹرانسمیٹر کے ذریعہ رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

یہ فن مسلسل مشق اور [illegible] طریقہ پر عمل کر کے کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی [illegible] اور مشق کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے کشف [illegible] دکھانے کی حد تک شہرت پائی ہے۔ دیوتا ناول ایک [illegible] انسان کی آپ بیتی ہے۔ میری رائے میں ہر شخص اپنی روح کی برقی طاقت اور ذہن کے کنٹرول سسٹم پر قابو پا کر ٹیلی پیتھی کا ماہر بن سکتا ہے۔ میری نظر میں کتاب [illegible] پہاڑی بھوجلہ دہلی سے شائع شدہ کتاب ٹیلی پیتھی گائیڈ ایک مکمل ہدایت نامہ ہے۔

محی الدین نواب



فیروز گل کا پیغام شاہ بخت نے ریشم کے والد کے پاس بھجوایا تھا اور انہوں نے قسمت کا شکر ادا کرنے کے بعد پیغام منظور کر لیا تھا حالانکہ وہ اس لیے خائف تھے کہ غریب آدمی تھے جبکہ شاہ بخت قبیلے کا سردار تھا اور قبیلے میں بھی کئی لڑکیاں موجود تھیں جن کے والدین دولت مند اور عزت و وقار کے مالک تھے۔ لیکن شاہ بخت انہیں نظر انداز کر کے ریشم کا رشتہ مانگ رہا تھا۔ تاہم جب شاہ بخت نے اپنا عندیہ ظاہر کیا تو ریشم کے والد مان گئے۔ اس روز شاہ بخت بہت خوش تھا۔ اس خوشی میں اس نے ایک عظیم الشان ضیافت کا اہتمام کیا، جس میں قبیلے کے سبھی معززین شریک ہوئے اور پھر ضیافت کے دوران اس نے بڑے فخر و مسرت کے ساتھ فیروز گل اور ریشم کی منگنی کا اعلان کیا۔

ریشم نے پوچھا تھا: "ابا جان، آپ کو وہ رات یاد ہے جب میرا [illegible] لگا تھا لیکن شاہ بخت بھلا وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ [illegible] وہ رات بلکہ اس سے پہلے کے خوب صورت دن اور بعد کی یادیں [illegible] فیروز گل اس کا ایک ہی بیٹا تھا، اس کی مرحومہ بیوی کی طرف سے ایک ہی نشانی۔ لہٰذا اس نے طے کر لیا تھا کہ شادی ایسی دھوم دھام سے کرے گا کہ لوگ برسوں یاد کریں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ قبیلے میں ایسی شادی نہ پہلے کبھی ہوئی تھی، نہ بعد میں کبھی ہوئی۔ شاہ بخت نے دل کے ملے ہی ارمان نکال ڈالے تھے۔ دن میں شادیانے بجتے تھے اور شادی کے گیتوں سے حویلی گونجتی رہتی تھی۔ رات ہوتی تو ہزاروں قندیلوں سے حویلی کا چپہ چپہ منور ہوتا۔ پھر وہ دن آیا جب شادی ہوئی تھی۔ شاہ بخت نے ولیمے کے لیے شادی سے اگلا دن مقرر کیا تھا اور اس سلسلے میں اس نے زبردست اہتمام کیا تھا۔ [illegible] اہتمام تکمیل تک ضرور پہنچتا۔ ایک یادگار دعوتِ ولیمہ ضرور ہوتی اور شاہ بخت کے ارمان ضرور پورے ہوتے بشرطیکہ اگلا دن [illegible] جس طرح شاہ بخت چاہتا تھا مگر اگلا دن تو [illegible] نصف رات کے بعد معلوم ہوئی جب اس کے کانوں میں [illegible] بلند ہونے والی دلدوز چیخ کی آواز پہنچی۔

یہ شادی کی رات کا واقعہ [illegible] رات ڈھل چکی تھی۔ حویلی میں خاموشی تھی۔ اکثر مہمان اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ جو رہ گئے تھے وہ حویلی کے بیرونی حصے میں واقع مہمان خانے میں محو استراحت تھے۔ خود شاہ بخت بھی ایک بیرونی کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور تین افراد سے اگلے دن ہونے والی دعوتِ ولیمہ کے سلسلے میں گفتگو کر رہا تھا۔ فیروز گل اور ریشم یعنی دولہا دلہن حجلۂ عروسی میں جا چکے تھے جو حویلی کے عقبی حصے میں، مغربی کونے پر واقع تھا۔ نصف رات کا سناٹا اور اندھیرا ہر سو مسلط تھا۔ چاروں طرف پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ غالباً رات کے تین بجے کا عمل تھا۔ جب شاہ بخت نے اٹھتے ہوئے

دوستوں سے کہا: "میرے خیال میں اب سونا چاہیے۔ مجھے بہت کام صبح سب سے پہلے شروع کرنا ہوگا کہ..." لیکن اسے اپنا جملہ مکمل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ شب کے گہرے سناٹے میں اچانک ایک چیخ ابھری، ایک تیز، ماتمی، لرزاں چیخ بلند ہوئی اور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

شاہ بخت چونک کر بولا: "یہ کیا...؟"

"یہ تو لگتا ہے کسی کے چیخنے کی آواز تھی۔" ایک دوست نے کہا۔

"مگر کون چیخا تھا اور کیوں؟"

"آواز تو یوں محسوس ہوتی ہے جیسے پچھلے حصے سے آئی ہو۔" دوسرے دوست نے کہا۔

شاہ بخت نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن اسی وقت ایک بار پھر چیخ بلند ہوئی اور تب یک لخت شاہ بخت کو احساس ہوا کہ آواز حویلی کے عقبی حصے سے آئی ہے۔ وہ دہشت زدہ ہو کر یکایک اٹھا اور بے تحاشا دروازے کی جانب بھاگا۔ کمرے کے بعد برآمدہ تھا، پھر وسیع آنگن۔ شاہ بخت نے دیوانوں کی طرح آنگن عبور کیا، پھر عقبی برآمدے سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے دوست سردار خرم، سردار زمان اور دوسرے چند افراد بھی پیچھے پیچھے تھے۔ اوپر پہنچ کر شاہ بخت فیروز گل کے کمرے کی جانب بھاگتا دوڑتا چلا گیا۔ اتنی دیر میں حویلی میں خاصی افراتفری پیدا ہو چکی تھی۔ حویلی کے مختلف حصوں سے کئی افراد "کیا ہوا، کیا بات ہے" کی آوازیں لگاتے ہوئے عقبی حصے کی جانب لپکے تھے۔ شاہ بخت نے کمرے پر پہنچ کر زور سے دروازے پر ہاتھ مارا اور دہشت زدہ آواز میں کہا:

"فیروز گل کیا بات ہے، کیا ہوا؟"

جواب میں ریشم کی دہشت زدہ سی چیخ ابھری: "ابا جان!"

شاہ بخت نے کندھے کی پوری قوت سے دھکا دے کر دروازہ توڑ دیا۔ پھر وہ اندر داخل ہوا اور کمرے کے فرش نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

اندر جو منظر تھا اُسے کسی کہانی کا منظر ہونا چاہیے تھا یا پھر کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ۔ مگر بدقسمتی سے وہ منظر وہم یا خیالی [illegible] نہیں بلکہ حقیقت تھا۔ شاہ بخت نے دیکھا کہ بکھرے ہوئے پھول فرش پر بکھرے ہوئے ہیں۔ [illegible] فرش پر گر کر [illegible] ہو چکا ہے اور سارا [illegible] ادھر ادھر بکھرا ہے۔ دوسری اشیاء بھی بری طرح بے ترتیب ہیں۔ ریشم فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھی چیخ کر زار و قطار رو رہی ہے۔ [illegible] ہوش نہیں ہے۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ خون کے دھبے ہیں اور ریشم کے قریب ہی فرش پر فیروز گل پڑا ہوا ہے۔ اس کے ہاتھ [illegible] پھیلے ہوئے ہیں اور اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں خوف سے زیادہ حیرت جھلک رہی ہے [illegible]

کے پنجے اور ہتھیلیوں پر گہرے زخم ہیں۔ جن سے سُرخ سُرخ لہو اُبل اُبل کر فرش پر پھیلتا چلا گیا ہے اور وہ اپنے باپ کو سردار شاہ بخت کو اس حادثے کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے بالکل قاصر ہے، کیونکہ وہ مر چکا ہے۔

شاہ بخت کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ "اوہ خدایا!"

پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلتا چلا گیا۔ دل کی دھڑکن معدوم ہونے لگی اور ٹانگیں رفتہ رفتہ بے جان ہوتی چلی گئیں۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ فیروز گل کے خون سے بھرے ہوئے سینے پر رکھ دیا اور نحیف آواز میں بولا۔ "فیروز گل، جانِ پدر۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ یہ کیا ہوا؟"

ریشم اپنے آپ سے، اپنے گرد و پیش سے اور اپنی خستہ حالی سے بے نیاز ہو کر روئے جا رہی تھی اور ساتھ ہی جذباتی انداز میں بہکتی بھی جا رہی تھی۔۔۔ "ادھر سے آئے تھے وہ لوگ ادھر سے، جاتے چلے، ہائے ہائے۔۔۔ میرے پروردگار یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، انھوں نے۔۔۔ ہاں ہاں ان بزدلوں نے فیروز پر خنجروں سے حملہ کیا۔۔۔ اور۔۔۔ اور میرے مولا۔۔۔ اب میں کیا کروں گی۔۔۔ کہاں جاؤں گی؟"

سردار خرم پھٹی پھٹی آنکھوں سے فیروز گل کی لاش کو اور بین کرتی ہوئی ریشم کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ ریشم کے جسم پر کوئی بھی زیور نہیں ہے۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے اُس کے جسم پر زیور ہی زیور تھے۔ کڑے، چوڑیاں، ہار، گلوبند، بھاری بُندے اور دوسرے زیور۔ اب صرف ایک دو چوڑیاں اور ایک کان میں ٹوٹے ہوئے بُندے کا نصف حصہ نظر آ رہا تھا۔ جب اُس نے ریشم کے الفاظ سنے تو لپک کر مغربی کونے والے دریچے کی طرف گیا جو کھلا ہوا تھا۔ سردار خرم نے باہر جھانکا۔ دریچہ ایک چھوٹی سی بالکونی میں کھلتا تھا۔ نیچے بالکونی کا عقبی باغیچہ تھا۔ سردار خرم کی نظریں سب سے پہلے اُس درخت پر پڑیں جو باغیچے کی چار دیواری کے قریب تھا اور اُس کی شاخیں بالکونی تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر اُس کی نظریں درخت کی شاخوں سے گزرتی ہوئی چار دیواری کے باہر گئیں اور اُسی وقت اُس کے کانوں میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آئیں۔ پھر چار دیواری کے باہر اُسے چند دھندلے ہیولے نظر آئے جو گھوڑوں اور انسانوں کے تھے۔ سردار خرم ابھی اس پورے منظر کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں سکا تھا کہ وہ گھوڑے تیزی سے دوڑتے ہوئے اندھیرے میں درختوں اور ٹیلوں کے عقب میں غائب ہو گئے۔

سردار خرم تیزی سے پلٹا اور سردار زمان کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ اب کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ پھر بھی ایک اضطراری حالت میں وہ حویلی سے نکل کر اُس جگہ پہنچا جہاں اُس نے گھڑ سوار دیکھے تھے۔ مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ دُور تک اندھیرا اور خاموشی مسلط تھی۔ سردار زمان جو اب تک کچھ نہیں سمجھ سکا تھا مضطرب ہو کر بولا۔

"کیا بات ہے سردار خرم! تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"میں نے یہاں کچھ گھوڑے سوار دیکھے تھے۔" سردار خرم نے بے حد پریشان لہجے میں جواب دیا۔ "جب میں نے دریچے سے جھانکا تھا تو وہ لوگ یہاں تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ اس طرف چلے گئے۔" سردار خرم نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بات پوری کی۔

سردار زمان تذبذب کے ساتھ اُس طرف دیکھنے لگا جدھر سردار خرم نے اشارہ کیا تھا۔ اُس طرف آبادی نہیں تھی۔ بس چٹیل زمین اور اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا۔ سردار زمان کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اُس نے قدرے پریشانی کے ساتھ سردار خرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ۔۔۔؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اُن کی شکلیں تو نہیں دیکھ سکا۔" سردار خرم نے کہا۔ "لیکن یہ طے ہے کہ فیروز گل کے قتل میں انھی لوگوں کا ہاتھ ہے۔" سردار خرم ایک پل کے لیے رکا، پھر گھوم کر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سردار زمان تم دیکھ سکتے ہو کہ باغیچے کی چار دیواری محض پانچ فٹ اونچی ہے اور اس پر چڑھ کر دوسری طرف اترنا کچھ مشکل نہیں۔ دیوار کے قریب ہی درخت ہے۔ جس کی شاخیں کمرے کی بالکونی تک پہنچتی ہیں۔ اُن کے لیے درخت پر چڑھ کر کمرے تک پہنچنا بالکل آسان تھا۔ چنانچہ وہ لوگ۔۔۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" سردار زمان نے مضطرب





ہو کر کہا۔ "لیکن سوال یہ ہے کہ وہ لوگ تھے کون اور انھوں نے فیروز گل کو کیوں قتل کیا؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" سردار خرم نے جواب دیا۔ "بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

"کم از کم ایک وجہ تو نظر آتی ہے۔" سردار زمان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تم نے شاید غور نہیں کیا کہ وہ سارے زیور جو دلہن نے پہن رکھے تھے، غائب ہیں۔"

"تو تمھارا مطلب ہے کہ انھوں نے صرف زیوروں کے لیے یہ حرکت کی ہے؟"

"بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے کہ شاید وہ لوگ جو کوئی بھی تھے انھیں بہرحال یہ بات معلوم تھی کہ یہ شادی کا گھر ہے اور سردار شاہ بخت کی بہو کے بدن پر لاکھوں کے زیورات ہوں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے پہلے ہی سے سب معلومات حاصل کر رکھی ہوں گی۔ مثلاً یہ کہ دولہا دلہن کا کمرہ کس طرف ہے اور یہ کہ مہمان حویلی کے کس حصے میں ہوں گے۔ ورنہ عین شادی کی رات وہ لوگ ایسے اقدام کی جرأت نہ کرتے۔"

"چلو تسلیم۔" سردار خرم نے واپس مڑتے ہوئے کہا۔ "تاہم سوال یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کا مقصد زیور لوٹنا ہی تھا تو پھر فیروز گل کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بہت سیدھی سی بات ہے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ فیروز گل خاموش بیٹھا تماشا دیکھتا رہتا۔ وہ ایک دلیر اور غیرت مند نوجوان تھا۔ اُس نے یقیناً مزاحمت کی ہوگی اور پھر ان لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا ہوگا کہ فیروز گل کو قتل کر دیں۔"

"ہاں، شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" سردار خرم ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مگر یہ بے حد المناک سانحہ ہے۔ میرا تو دل دہل کر رہ گیا ہے۔ [illegible] شادی کی رات۔ ایک نئی زندگی کا آغاز اور یہ اندوہناک واقعہ! [illegible] تم نے کبھی اس سے زیادہ الم انگیز اور ناقابلِ یقین واقعے کا مشاہدہ کیا یا تجربہ کیا ہے؟"

"کبھی نہیں، کبھی نہیں۔" سردار زمان بولا۔ "میں تو ایسی کسی بات کا کبھی تصور تک نہیں کر سکتا۔ ستم یہ کہ فیروز گل شاہ بخت کا صرف ایک ہی بیٹا تھا۔ اس پر تو سمجھو کہ بس قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

"میں تو حیران ہوں کہ بیٹی ریشم اور سردار شاہ بخت اس صدمے کو کیونکر برداشت کریں گے؟"

"بس خدا ہی رحم کرنے والا ہے۔"

دونوں کمرے میں واپس آئے۔ فیروز گل کی لاش اب پلنگ پر رکھ دی گئی تھی۔ ریشم پلنگ کی پائنتی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور سکتے کی سی حالت میں فیروز گل کے پیروں کو گھورے جا رہی تھی۔ شاہ بخت سرہانے بیٹھا تھا اور بدستور سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ دوسرے لوگ بھی آبدیدہ اور غمگین تھے۔ سردار زمان، شاہ بخت کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے تسلی دینے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ سردار خرم کچھ دیر کھڑا حسرت، تحیر اور اشک آلود نظروں سے کبھی ریشم کو اور کبھی شاہ بخت کو دیکھتا رہا۔ اس وقت اُس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اندر ہی اندر اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے اپنی طویل زندگی میں بے شمار المناک سانحات اور دردناک مشاہدہ کیا تھا مگر ایسا کربناک منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ منظر تو سب سے الگ اور ناقابلِ یقین تھا۔ کمرے میں ایک باپ موجود تھا۔ جس نے دن کا سکھ اور رات کی نیندیں قربان کر کے اپنے بیٹے کی پرورش کی تھی اور لاکھوں ارمانوں سے اُسے دولہا بنایا تھا مگر اب اسی بیٹے کی لاش اُس کے سامنے پڑی تھی اور اُس کی آنکھیں برسات کے بھرے بادلوں کی طرح برس رہی تھیں اور کمرے میں ایک دلہن موجود تھی شباب کے ان گنت رنگین ارمانوں سے بھری ہوئی دلہن جس کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ لیکن جس کے ہاتھوں میں حنا ابھی پوری طرح رچی بھی نہیں تھی جس کے ہونٹوں پر شادمانی کے پھول ابھی پوری طرح کھلے بھی نہیں تھے اور جس کا حُسن ابھی ان چھوا ہی تھا کہ وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ یہ کیسا المیہ تھا، یہ کیسی بدبختی تھی جو شاہ بخت کے گھر میں نازل ہوئی تھی کیا زندگی اتنی سنگ دل، بے مروّت اور بے حس بھی ہو سکتی ہے اور کیا آسمان اتنا نامہربان بھی ہو سکتا ہے؟ سردار خرم کو یہ بات ماننے میں تامّل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر نمناک نظروں سے اس پورے منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک بار پھر بالکونی میں چلا گیا اور دُور تک پھیلے ہوئے اندھیرے میں اُسی سمت دیکھنے لگا جدھر گھڑ سوار گئے تھے۔ چند منٹ بعد وہ پلٹا اور پھر اُسی وقت اُس کی نظر دروازے کے قریب پڑی ایک سیاہ شے پر پڑی۔ سردار خرم نے غیر ارادی طور پر جھک کر اُسے اٹھا لیا۔ اور پھر بے اختیار اُس کے لبوں سے نکلا۔

"ارے یہ کیا!"

پھر اُس نے سردار زمان کو آواز دی۔

سردار زمان اُس کے پاس آیا تو ساتھ ہی ساتھ سردار سکندر بھی آیا۔ سردار سکندر، شاہ بخت کا دوست اور ایک چھوٹے سے قبیلے کا سردار تھا۔ اس کی بستی شاہ بخت کی حویلی سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ جہاں وہ اپنے قبیلے کے افراد کے درمیان ایک چھوٹی سی حویلی میں رہتا تھا۔ ہرچند کہ وہ شاہ بخت کا دوست تھا مگر پچھلے کچھ دنوں سے اُس کے تعلقات شاہ بخت سے کشیدہ تھے پھر بھی وہ بڑے اہتمام سے شادی میں شریک ہوا تھا اور حسبِ توفیق تحائف بھی پیش کیے تھے۔

اُس نے کافی اونچی آواز میں پوچھا۔ "کیا ہوا سردار خرم! کیا

بات ہے؟"
"یہ دیکھو۔" سردار خرم نے وہ سیاہ شے سردار زمان اور سردار سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں دروازے کے قریب ملا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ جب پہلے میں بالکونی میں آیا تھا تب اس پر میری نظر نہیں پڑی تھی۔"
سردار زمان نے دیکھا کہ وہ سیاہ چمڑے کا بنا ہوا ایک آئی پیچ ہے، جس کا تسمہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سردار زمان کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا۔ "شہباز!"
"نہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سردار سکندر نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "شہباز کا نام تو برسوں سے نہیں سنا گیا۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔"
"ٹھیک ہے، دو تین برسوں سے اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔" سردار خرم بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ایسا پیچ صرف شہباز ہی استعمال کرتا تھا کیونکہ اس کی ایک آنکھ خراب تھی۔"
"تو کیا تمہارا مطلب ہے کہ شہباز۔۔۔" سردار زمان بات پوری کیے بغیر ہی چپ ہو گیا۔
سردار خرم نے اس کی طرف دیکھا، مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ پھر وہ افسوس بھری نظروں سے شاہ بخت اور ریشم کی طرف دیکھنے لگے۔
فیروز گل کی موت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایک بڑا سانحہ تھا جس نے شاہ بخت کی زندگی کی ساری بنیادیں ہلا دی تھیں۔ فیروز گل اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کے نام، اس کی شان و شوکت اور اس کی تمام جائداد کا تنہا وارث۔ اور جب ایسا بیٹا بچھڑ جائے تو زندگی بڑی بے ثبات، لایعنی اور بے قیمت ہو جاتی ہے۔ شاہ بخت بھی بالکل ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے دوستوں اور عزیزوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ قبیلے کے معاملات سے بھی اس کی دلچسپی کم ہو گئی۔ حویلی سے نکلنا تو قریب قریب ترک ہی کر دیا تھا۔ بہت زیادہ تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ کسی کمرے میں یا بالکونی میں اکیلا بیٹھا رہتا۔ خاموش، اداس اور مایوس اور پلک جھپکائے بغیر خلا میں گھورتا رہتا، کچھ اس طرح جیسے اس کی نظریں فیروز گل کو تلاش کر رہی ہوں۔
فیروز گل کے قتل میں کن لوگوں کا ہاتھ تھا، اس راز پر سے کبھی پردہ نہیں اٹھ سکا۔ ہر چند کہ پولیس نے اس معاملے میں بے حد مستعدی اور ذمے داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ لیکن ان کی تمام جدوجہد اور تحقیقات کا نتیجہ صفر کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ عام خیال یہی تھا کہ فیروز گل کے قتل میں شہباز کا ہاتھ ہے۔ شہباز اس علاقے کا ایک خاصا بدنام ڈاکو تھا۔ کئی سال تک اس نے علاقے کے عوام اور قانون کے محافظوں کی نیندیں حرام کیے رکھی تھیں۔ اس نے بے شمار ڈاکے ڈالے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ ہیرے جواہرات اور زیورات کا بہت شوقین ہے اور عموماً جواہرات اور زیورات ہی کے لیے ڈاکے ڈالتا ہے۔ وہ غریبوں کو کبھی نہیں لوٹتا تھا۔ اس کا نشانہ عموماً دولت مند لوگ بنتے تھے۔ پولیس نے اسے گرفتار کرنے کی انتھک کوشش کی تھی، مگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ وہ تو ایک چھلاوا تھا۔ آج یہاں، کل وہاں۔ بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا، اور جنھوں نے دیکھا تھا، وہ جانتے تھے کہ شہباز کی ایک آنکھ خراب ہے جسے چھپانے کے لیے وہ سیاہ چمڑے کا ایک پیچ استعمال کرتا ہے اور جب فیروز گل کے کمرے میں سیاہ چمڑے کا ایک پیچ ملا تو قدرتی طور پر خیال شہباز کی طرف گیا۔ پولیس کا خیال تھا کہ مزاحمت اور جدوجہد کے نتیجے میں پیچ کا تسمہ ٹوٹ گیا ہوگا اور شہباز کو اتنا موقع نہیں ملا ہوگا کہ پیچ کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے پیچ گرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا ہو۔ بہرحال سب کچھ بھی ہو، اگر یہ قیاس درست تھا تو اس بوسیدہ چمڑے کے ٹکڑے کے ملنے کا ایک ہی مطلب تھا، شہباز۔ تاہم ایک بات تعجب کی تھی اور وہ یہ کہ گزشتہ دو ڈھائی سال سے شہباز کا نام سننے میں نہیں آیا تھا۔ اس کی تمام سرگرمیاں بالکل ختم ہو گئی تھیں۔ اس عرصے میں ایک بھی ڈاکا نہیں پڑا تھا۔ ایک بھی راہزنی کی واردات نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے شہباز کو کہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا شاید وہ مر چکا ہے۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ علاقہ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بعض خوش فہم ایسے بھی تھے کہ جن کے خیال کے مطابق وہ تائب ہو کر شریفانہ زندگی گزارنے لگا تھا لیکن جب فیروز گل کے کمرے میں آنکھ کا پیچ ملا تو سب قیاسات غلط ثابت ہوئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ شہباز کچھ عرصے کے لیے علاقہ چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب واپس آگیا ہے اور فیروز گل کے قتل میں اسی کا ہاتھ ہے اور ثبوت یہ ہے کہ وہ دلہن کے تمام زیور اور جواہرات لے گیا ہے۔
ریشم حویلی ہی میں تھی۔ حالانکہ بیٹے کی موت کے کچھ عرصے بعد شاہ بخت نے کوشش بھی کی تھی کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے لیکن ریشم نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ "اب تو یہی میرا گھر ہے۔ یہیں جیوں گی، یہیں مروں گی۔" تب شاہ بخت چپ ہو گیا تھا۔ ریشم اسے بیٹی کی طرح عزیز تھی اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جس سے ریشم کو دکھ پہنچے۔ لیکن جب جب وہ ریشم کو دیکھتا اس کے دل میں ٹیسیں سی اٹھنے لگتیں۔ ریشم کی عمر اس وقت محض سولہ سال تھی۔ ایک ایسی کلی، جو ابھی پوری طرح کھل کر پھول بننے کی منتظر ہی تھی کہ اس کی جوانی خزاں پوش ہو گئی تھی۔ شاہ بخت اسے دیکھتا، سوچتا اور رنجیدہ ہو جاتا کہ وہ کیوں کر زندگی گزارے گی۔ بیوگی کا زہر بہت تلخ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ کیا ریشم کو یہ زہر ساری عمر پینا پڑے گا؟ پھر شاہ بخت سوچتا کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ابھی زخم ہرے ہیں، ذرا بھر جائیں تو میں کچھ کروں گا۔ پہلے بیٹے کی شادی کی تھی، اب بیٹی کی



سوچ کر اس کے دل کو تھوڑی سی تسلی میسر آ جاتی۔
ریشم بے شک بالکل نوجوان تھی لیکن وہ بہت سمجھدار اور باہمت تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور حویلی کے سلسلے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ شاہ بخت کی تمام ضروریات کا خیال بھی وہ خود ہی رکھتی تھی۔ اس کے کھانے کی فکر کرتی، حقہ بھی خود تازہ کرتی اور اخبار پڑھ کر سناتی۔ شاہ بخت کی اداسی، مایوسی اور خاموشی سے اسے بڑا دکھ ہوتا تھا۔ وہ اکثر اس سے پوچھتی اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ مگر شاہ بخت نرمی اور محبت سے ٹال جاتا۔ وہ سوچتا میں ریشم کو کیا بتاؤں۔ ریشم تو ابھی بچی ہے۔ بھلا میرے دکھوں کو کیا سمجھے گی۔ لیکن وہ زیادہ دن تک اپنے احساسات کو چھپا کر نہیں رکھ سکا۔
وہ ایک خاموش اور اداس سہ پہر تھی۔ ہر طرف ایک بوجھل سا سناٹا طاری تھا۔ ڈھلتے ہوئے دن کی نارنجی دھوپ حویلی کے بلند و پست میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھی۔ شاہ بخت جنوبی بالکونی میں بیٹھا تھا، حسب معمول خاموش اور افسردہ۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بے حد خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ احساس، جذبے، خیال، دل اور روح ہر شے خالی تھی اور صرف اندر ہی نہیں، باہر بھی سب کچھ خالی تھا۔ زمین خالی تھی، آسمان خالی تھا۔ جانے کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا تھا کہ ہر شے بالکل کھوکھلی اور ویران ہو جاتی تھی۔ کسی خشک اندھے کنوئیں کی طرح۔ شاہ بخت کافی دیر سے اکیلا بیٹھا اس اندھے کنوئیں کے اندر گونجنے والی اداسیوں اور ماتمی آوازوں کو سن رہا تھا کہ اسی وقت ریشم آ گئی۔ وہ سہ پہر کی چائے اور ناشتہ لے کر آئی تھی۔ شاہ بخت اسے دیکھ کر افسردگی سے مسکرانے لگا۔
ریشم نے چائے بنا کر شاہ بخت کو دی۔ ایک پیالی اپنے لیے بھی بنائی۔ دونوں چائے پیتے رہے اور خالی خالی نظروں سے دور تک پھیلی ہوئی سنگلاخ پہاڑیوں پر دم توڑتی دھوپ کو دیکھتے رہے۔ جب خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو معاً ریشم نے زور سے سانس لی اور شاہ بخت کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔
"بابا جان! آج آپ بہت خاموش ہیں، کیا بات ہے؟"
شاہ بخت چونک کر بولا۔ "نہیں بیٹی! کوئی بات نہیں۔"
ریشم لمحہ بھر چپ رہی اور توجہ سے شاہ بخت کو دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔ "بابا جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک بات پوچھوں؟"
"ہاں ہاں کیوں نہیں، ضرور پوچھو۔"
ریشم نے بے حد نرم اور محبت آمیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "بابا جان! میں دیکھتی ہوں کہ آپ بہت خاموش رہتے ہیں۔ کہیں آتے جاتے بھی نہیں اور زبان سے کچھ کہتے بھی نہیں۔ حالانکہ میں کئی بار آپ سے پوچھ چکی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔ کوئی فکر یا پریشانی آپ کو گھیرے رہتی ہے لیکن آپ مجھے نہیں بتاتے۔ آخر کیوں بابا جان! کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟"
"بے شک تم میری بیٹی ہو لیکن۔۔۔" شاہ بخت کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے گردن موڑ کر غور سے ریشم کو دیکھا اور تذبذب میں پڑ گیا۔ کہے نہ کہے، کیا ریشم اس کے احساسات کو سمجھ سکے گی؟ کہیں اس کے نازک دل کو اس کی باتوں سے صدمہ نہ پہنچے۔ اسے خاموش دیکھ کر ریشم نے پھر کہا۔
"کہیے نا بابا جان! آخر آپ چپ کیوں ہو گئے؟"
"سوچتا ہوں بیٹی کہیں میری باتوں سے تمہیں دکھ نہ پہنچے۔"
"مجھے کوئی دکھ نہ پہنچے گا۔ میں تو آپ کے دکھ بانٹنا چاہتی ہوں۔ بتائیے نا؟" ریشم نے اصرار کیا۔
تب شاہ بخت نے طے کیا کہ اسے مزید خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ دل کی بات زبان پر لانے سے اور کچھ حاصل ہو نہ ہو کم از کم یہ تو ہوگا کہ ریشم کی خواہش پوری ہو جائے گی اور خود اس کے اپنے بوجھ میں بھی شاید کمی ہو جائے۔ اس نے پیالی ٹیبل پر رکھ دی۔ حقے کی نے ہونٹوں میں دبا کر ایک کش لیا اور دور خلا میں گھورتے ہوئے تھکی تھکی آواز میں کہنے لگا۔
"جان بابا! یہ باتیں بہت ناخوشگوار اور قدرے عجیب ہیں، شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئیں۔ لیکن تم اگر میری جگہ ہوتیں تو بڑی آسانی سے سمجھ لیتیں۔ بیٹا! زندگی ایک بڑی عجیب شے ہے۔ اس کے ان گنت روپ ہیں اور ہر روپ ایک دوسرے سے جدا اور اتنا اجنبی کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ یہ زندگی کبھی معصوم بچے کی قلقاری ہے تو کبھی اس ماں کی آہ، جس کی گود خالی ہو گئی ہو۔ کبھی یہ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول ہے تو کبھی ننھی پھوٹتی ہوئی کونپل۔ زندگی کے ایسے ہی ان گنت روپ ہیں۔ ایک روپ ہے خوابوں کا ٹوٹنا۔ کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ آدمی ایک خواب دیکھتا ہے۔ ساری زندگی اس خواب سے اپنی امیدوں اور آرزوؤں کو سجاتا ہے۔ لیکن پھر ایک دن آتا ہے کہ یہ خواب اچانک ٹوٹ کر ریت کی طرح بکھر جاتا ہے اور آدمی کے ہاتھ میں مایوسی اور محرومی کی راکھ باقی رہ جاتی ہے۔ بس کچھ ایسا ہی میرے ساتھ ہوا ہے۔ فیروز گل میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ میں نے اسے بڑی محبت سے پالا تھا۔ بڑے ارمان تھے میرے۔ بہت سپنے دیکھے تھے۔ میں نے سوچا تھا، فیروز گل کی شادی کروں گا۔ اس حویلی میں ایک چاند سی دلہن آئے گی۔ پھر فیروز گل کے یہاں بچے ہوں گے اور یہ حویلی جو برسوں سے چپ، اداس اور ویران ہے، اچانک بھر جائے گی اور میرے نام کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا بلکہ اور آگے چلے گا۔"
ریشم کی آنکھوں میں اچانک آنسو آ گئے۔ اس نے غم زدہ اور قدرے پشیمان ہو کر کہا۔ "بابا جان! مجھے افسوس ہے کہ میری ذات آپ کی امیدوں کی تکمیل کا باعث نہ بن سکی۔ لیکن اس میں میرا قصور کوئی

قصور نہیں ہے۔"
شاہ بخت نے ... سے کہا۔ "میں نہیں بیٹا! تم اپنے آپ کو قصور وار مت سمجھو ... کسی کا بھی نہیں۔ نہ تمہارا نہ میرا۔ میں بس یہ تو کہہ رہا تھا کہ میری ... تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی تمہاری ضد سے مجبور ہو کر میں ... یہ باتیں کہی ہیں۔ مگر میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا کہ میں تمہیں کسی طور بھی ... دار سمجھتا ہوں۔ تم تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو۔"

ریشم تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر نم آواز میں بولی۔ "بابا جان! میں آپ کے دکھ کو سمجھتی ہوں۔ لیکن یہ سب تو تقدیر کا کھیل تھا۔ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ اللہ کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اور میں بھی دھیرے دھیرے صبر کرنا سیکھ رہا ہوں لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

شاہ بخت نے ... سانس بھر کر ریشم کی جانب دیکھا۔

"لیکن جان بابا! میری پریشانی کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟"

شاہ بخت کچھ دیر چپ رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے حقے کی نے ٹیبل پر ڈال دی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور افسردہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بیٹا! مجھے ایک پوتے کی بڑی آرزو تھی۔ بلکہ یوں کہو کہ ضرورت تھی۔ تم جانتی ہو کہ میں نہ صرف ایک بڑے قبیلے کا سردار ہوں بلکہ میری ذاتی دولت اور جائداد بہت زیادہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ مجھے اپنے باپ سے ملا تھا۔ باقی دولت میں نے برس ہا برس تک انتھک جانفشانی اور محنت سے خود جمع کی۔ میں نے سوچا تھا کہ میری تمام دولت اور جائداد کا وارث میرا بیٹا ہوگا اور اس کے بعد اس کی اولاد۔ اسی لیے پوتے کی تمنا تھی۔ جو ظاہر ہے کہ اب پوری نہیں ہو سکتی اور اگر تم غور کرو تو یہ تردد بڑی آسانی سے تمہاری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے قبیلے کی اپنی کچھ روایتیں اپنے کچھ قانون ہیں۔ جن پر پشتوں سے بڑی سختی سے عمل ہوتا آیا ہے اور ان قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ میں اگر چاہوں بھی تو اپنی دولت اور جائداد کا وارث تمہیں نہیں بنا سکتا۔"

ریشم یکایک چونک کر بولی۔ "تو کیا آپ مجھے وارث بنانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ تم اس حویلی کی عزت ہو۔ میرے بیٹے کی بیوی ہو۔ بیٹا نہیں رہا مگر تم تو موجود ہو۔"

"لیکن بابا جان! مجھے دولت اور جائداد نہیں چاہیے۔ مجھے تو آپ کی

## ضرورت

فارمیسی میں ... ایک لڑکی نے آ کر ایک ...
فارمیسی نے فوراً سیڑھی اٹھائی اور ... سے
کوئی موٹی ... بوتل اتار کر دی۔
"مجھے ایک نوجوان ... آدمی کو کوئی کیڑے کے ...
... گھسنے کی جگہ لگا ہے۔"
فارمیسی والا "نہیں ... یہ ... نہیں ...
... عورت نے جواب دیا۔
"مجھے معلوم ... بہت ... اسی لیے ... کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔"

## ناخلف بیٹا

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ ایک شہر "دیار بکر" میں ایک بڑھا مہمان تھا۔ جس کے پاس بے شمار دولت تھی۔ اس کا ایک خوبصورت نوجوان لڑکا تھا جس سے اس کو بے حد محبت تھی۔ ایک رات وہ کہنے لگا ساری عمر میں میری ایک ہی اولاد ہوئی۔ اس جنگل میں ایک درخت ہے لوگ اپنی مرادیں مانگنے وہاں جاتے ہیں۔ میں نے بہت سی طویل راتیں اس درخت کی جڑ میں بیٹھ کر خدا کے سامنے روتے ہوئے گزاری ہیں تب کہیں جا کر یہ فرزند مجھے نصیب ہوا ہے۔

سعدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ وہ لڑکا چپکے چپکے اپنے دوستوں سے کہہ رہا تھا کہ کاش مجھے اس درخت کا علم ہوتا تاکہ میں وہاں جا کر دعا کرتا کہ اس بڈھے سے میری جان چھوٹے۔



دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت نیک ہو اور تمہیں دولت کا کوئی لالچ نہیں۔" شاہ بخت نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ "لیکن بیٹا! اس مسئلے کو میرے نکتہ نظر سے سمجھو۔ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ قدرتی طور پر وہ سب میں اسے دینا چاہتا ہوں جو مجھے سب سے عزیز ہو۔ قبیلے کی سرداری، دولت اور جائداد۔ تم سے زیادہ قریب اور عزیز میرا اور کوئی بھی نہیں۔ مگر افسوس میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

ریشم چند لمحے فکر مند نظروں سے شاہ بخت کو دیکھتی رہی۔ مسئلے کی نوعیت اور اہمیت کچھ کچھ اس پر واضح ہو گئی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے متردد لہجے میں پوچھا۔

"اگر آپ ایسا نہیں کر سکے تو پھر کیا ہوگا بابا جان؟"

"ہوگا کیا؟" شاہ بخت مایوس ہو کر کہنے لگا۔ "ہمارے اپنے قانون اور رواج کے مطابق جب میں نہیں رہوں گا تو قبیلے کی سرداری اور میری دولت اور جائداد کا واحد حقدار سردار بختیار کو چلا جائے گا۔ باقی دوسرے رشتے داروں میں تقسیم ہو جائے گا۔" شاہ بخت ایک پل کے لیے رکا پھر رنجیدہ آواز میں بولا۔ "جان بابا! اگر میرا کوئی قریبی بھائی، بھتیجا یا بھانجا ہوتا تو مجھے دکھ نہ ہوتا لیکن بختیار سے زیادہ قریبی اور کوئی رشتے دار نہیں اور یہ تصور ہی میرے لیے بے حد اذیت ناک ہے کہ میرا جو کچھ بھی ہے وہ سب بختیار اور اس کے گھرانے کو چلا جائے گا۔"

"اور آپ کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ اس قانون میں کوئی تبدیلی کر سکیں؟"

"نہیں، اصول اور قوانین اتنی آسانی سے تبدیل نہیں ہوتے۔"

ریشم چپ ہو گئی۔ اس وقت اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی تھی۔ شاہ بخت کی خاموشی، اداسی اور پریشانی کا راز اس پر منکشف ہو چکا تھا اور وہ مسئلے کی اہمیت کو بھی پوری طرح سمجھ گئی تھی۔ یہ بھی جان گئی تھی کہ شاہ بخت کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو اس کے احساسات و جذبات بھی قطعاً مختلف نہ ہوتے۔ ریشم کو حویلی میں آئے ہوئے ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ مگر وہ بہت سی باتوں سے واقف ہو گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سردار بختیار، شاہ بخت کا اگرچہ کافی دور کا رشتے دار ہے مگر رشتے کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ دوسرے رشتے داروں کے برعکس قبیلے کے قانون کے مطابق وہی شاہ بخت کی تمام دولت، جائداد اور قبیلے کی سرداری کی وراثت کا حقدار ٹھہرتا تھا۔ اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو شاید زیادہ تردد نہ ہوتا کیونکہ شاہ بخت نرم دل اور محبت کرنے والا آدمی تھا اور اپنے رشتے داروں کو دل سے عزیز جانتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے صورت یہ تھی کہ شاہ بخت اور سردار بختیار کے تعلقات مدتوں سے کشیدہ تھے۔ شاہ بخت نے خود کوئی نامناسب بات کبھی نہیں کی تھی۔ یہ تو سردار بختیار تھا جو دل میں عناد رکھتا تھا اور جب بھی موقع ملتا تھا، وہ شاہ بخت کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن ایک دوسرے کے لیے ان کی نفرت اور عداوت اندر ہی اندر تھی جو دونوں تک ہی محدود تھی۔ بہت کم لوگ اس سے واقف تھے۔ شاہ بخت اپنی جانب سے پوری کوشش کرتا تھا کہ یہ عداوت زیادہ نہ پھیلنے پائے۔ اس نے سردار بختیار سے صلح صفائی کی کوشش بھی کی تھی مگر بات نہیں بنی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بننے کی بجائے مزید بگڑ گئی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ صلح کی کوششوں کے دوران سردار بختیار نے شاہ بخت کے سامنے فیروز گل کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کی تجویز رکھ دی۔ یہ تجویز ایسی تھی کہ شاہ بخت کسی صورت اسے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ سردار بختیار کی لڑکی صورت شکل، تعلیم، سلیقہ اور خانہ داری، کسی بھی لحاظ سے شاہ بخت کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس میں ایک جسمانی نقص بھی تھا جو اس کی شخصیت کو اور بھی کمتر بنا دیتا تھا۔ شاہ بخت نے مجبوراً معذرت کر لی تھی۔ لیکن وہ بات سردار بختیار کے دل سے نہیں نکلی اور اس کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بعد ازاں فیروز گل کی شادی ریشم سے ہوئی تو سردار بختیار بہت جز بز ہوا تھا اور صرف خوش دلی کے لیے شادی میں شریک ہوا تھا۔

لیکن اب فیروز گل مر چکا تھا۔ ریشم بیوہ ہو گئی تھی اور شاہ بخت بڑھاپے کے صحرا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اس کے نام کا جانشین جا چکا تھا اور ایک دن آئے گا جب شاہ بخت بھی نہیں رہے گا اور تب یہ تمام دولت اور جائداد اور شان و شوکت اور قبیلے کی سرداری سب کچھ سردار بختیار کو چلا جائے گا۔ وہ بختیار جس کے دل میں شاہ بخت کے لیے نرمی اور محبت کی ایک رمق بھی نہیں ہے۔ کیا اسی دن کے لیے شاہ بخت نے شب و روز محنت کی تھی۔ نہیں، نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ زندگی کی اس بازی میں اس کا سب سے بڑا پتہ کٹ چکا تھا اور وہ بازی ہار چکا تھا۔ وہ بے شک قبیلے کا سردار تھا مگر قبیلے کی روایات اس سے بڑی تھیں۔

بہت دیر تک خاموشی مسلط رہی۔ پھر ریشم نے ٹھنڈی سانس لے کر شاہ بخت کی طرف دیکھا اور آزردہ ہو کر بولی۔

"تو کیا اور کچھ نہیں ہو سکتا بابا جان؟"

شاہ بخت نے نفی میں اس طرح گردن کو جنبش دی جیسے اس کے سر پر کوئی بھاری بوجھ رکھا ہو۔

ہاں ٹھیک ہے۔ شاہ بخت کو سب کچھ یاد ہے۔ ایک ایک بات وہ سارے زخم ابھی ہرے ہیں جو ان واقعات نے اس کے دل پر لگائے تھے۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ اس نے اپنے طور پر بھی شہباز کے بارے میں جاننے اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی مگر کوئی سراغ نہ ملا تھا۔ فیروز گل کے قتل کے بعد ایک دو اور لرزہ خیز وارداتیں اور ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک واردات

تو وہ چونک پڑا۔ ارے کمال ہے! وہ تو دیکھتے دیکھتے جوان ہو گئی
اور مجھے خیال تک نہ ہوا۔ میں ابھی تک اسے بچی ہی سمجھ رہا تھا اور
پھر بوڑھے شاہ بخت کو ایک ساتھ کئی فکروں نے گھیر لیا۔ انہیں لگتا
جن کی طرف پہلے اس کا دھیان تک نہیں گیا مگر اب دھیان آیا تو وہ
پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا، افروز گل سترہ سال کا ہو گیا ہے زیادہ
سے زیادہ دو تین سال میں اس کی شادی ریشم سے کر دینا چاہیے مگر
کیا یہ بات آسان ہو گی۔ ریشم افروز گل سے پورے سترہ سال بڑی
ہے۔ کیا افروز گل اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو گا؟ اگر اس نے
انکار کر دیا تو کیا ہو گا؟ پھر یہ بھی ہے کہ قبیلے کے لوگ اور خود خاندان
کیا کہیں گے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کی نظر افروز گل پر ہے اور
وہ اپنی لڑکیوں کو حویلی کی ہونے والی خانم بنانے کے خواب دیکھ
رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ ریشم اور افروز گل کے رشتے کو آسانی سے
قبول کر لیں گے۔ نہیں، وہ یقیناً باتیں بنائیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے کھلی
مخالفت کریں گے۔ شاہ بخت کو محسوس ہوا کہ سترہ سال پہلے افروز گل
کی پیدائش کے وقت جو بات اسے بہت آسان نظر آتی تھی، اب
سترہ سال بعد وہ اتنی ہی مشکل ہو گئی ہے۔

کئی ماہ تک شاہ بخت اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہا۔ لیکن اس
سوچ بچار سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ آخر کار شاہ بخت نے طے کیا کہ
یوں دن رات اپنے آپ سے الجھنے اور پریشان ہونے سے کچھ حاصل
نہیں۔ عملی طور پر کچھ کرنا ہی مناسب رہے گا۔ چنانچہ فرصت کی
ایک شام شاہ بخت نے افروز گل کو ساتھ لیا اور ٹہلتا ہوا جھرنے
کی طرف نکل گیا۔ کچھ دیر دونوں چہل قدمی کرتے رہے پھر شاہ بخت
نے مناسب و موزوں الفاظ چنے اور نرم لہجے میں بولا۔

"افروز گل آج میں تم سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بابا جان! فرمائیے؟" افروز گل نے سعادت مندی
سے کہا۔

شاہ بخت ذرا دیر کو رکا، پھر بولا: "تمہیں یاد ہے کہ بچپن میں اکثر
تم سے کہا جاتا تھا کہ ریشم تمہاری دلہن ہے۔"

افروز گل یکبارگی جھینپ گیا۔ ذرا سا ہکلا کر بولا: "جی بابا جان!
مگر وہ تو مذاق تھا۔ ۔ ۔ ہے نا؟"

"نہیں، اُس وقت وہ بات مذاق کے رنگ میں ضرور کہی جاتی
تھی، مگر مذاق تھی نہیں۔"

"جی، میں سمجھا نہیں؟" افروز گل نے ٹھٹھک کر کہا۔ "وہ بات
مذاق نہیں تھی۔ تو پھر۔ ۔ ۔ تو کیا آپ کا مطلب ہے کہ۔ ۔ ۔؟"

"ہاں!"

"مگر بابا جان! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ریشم تو مجھ سے بڑی ہے۔
تقریباً دگنی عمر ہے اس کی۔"

"میں جانتا ہوں، مگر ابھی وہ جوان ہے۔" شاہ بخت نے کہا۔ "اور
تم مجھے ایک بات بتاؤ، کیا ریشم حسین نہیں ہے؟"

افروز گل مسکرایا: "مگر بابا جان! اس میں تو کوئی شک نہیں
کہ وہ بے حد حسین ہے، اتنی کہ پورے علاقے میں اس جیسی اور
کوئی نہیں۔"

"اور تم اسے پسند بھی کرتے ہو؟"

"بابا جان!" افروز گل نے متانت سے کہا: "ریشم اتنی اچھی ہے
کہ کوئی بھی اسے ناپسند نہیں کر سکتا۔ میں بھی اسے پسند کرتا ہوں لیکن۔ ۔ ۔"

"تو پھر تمہیں اس سے شادی کرنا ہو گی۔"

افروز گل نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔ ایک اچھے اور [illegible]
[illegible] تھا۔ اپنے باپ سے اسے بے حد محبت تھی اور وہ
اس کی اطاعت کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ دوسری طرف اس کے دل میں ریشم
کے لیے بھی بہت عزت تھی۔ چونکہ اس نے ریشم کو بیوی کے طور پر
کبھی نہیں دیکھا تھا مگر وہ اسے بہت پسند کرتا تھا اور اس میں بھی
کوئی شک نہیں تھا کہ ریشم اب بھی اتنی حسین، پرکشش اور پُرشباب
تھی کہ کوئی دوسری عورت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی تھی۔ مگر عمر میں
پورے سترہ سال کا تفاوت۔ ۔ ۔ افروز گل کچھ دیر سوچتا
رہا، پھر بولا۔

"لیکن بابا جان! آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ قبیلے والے کیا
کہیں گے؟"

"وہ ضرور باتیں بنائیں گے، مگر مجھے ان کی پروا نہیں۔ مجھے تو
تمہارا جواب چاہیے۔"

"کیا آپ نے ریشم سے بھی پوچھ لیا ہے؟"

شاہ بخت مسکرایا: "بیٹا، اس کی رضامندی تو اُس وقت ہی
لے لی تھی جب تمہاری ماں سے میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔"

"میری ماں سے آپ کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی!" افروز گل
اُچھل کر اور حیران ہو کر بولا: "بابا جان! آپ مجھے حیران کر رہے ہیں۔ آخر
آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ قصہ کیا ہے؟ آپ ریشم سے
میری شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟"

"بیٹا، یہ لمبی کہانی ہے، جو میرا خیال ہے کہ آج تمہیں سنا ہی دوں۔
تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ میرا ایک بیٹا اور بھی تھا۔ فیروز گل، جو میری
پہلی بیوی سے تھا اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایک حادثے میں وہ
مر گیا تھا۔ اس کے علاوہ تم کچھ نہیں جانتے کیونکہ ساری باتیں ہمیشہ تم
سے قصداً چھپائی گئی تھیں۔ آج وہ کہانی میں تمہیں سناتا ہوں۔ ۔ ۔"

شاہ بخت جھرنے کے کنارے ٹہلتا رہا اور اس کی مدھم آواز افروز گل
کے کانوں میں گونجتی رہی اور وہ حیران ہوتا رہا اور یقین نہ کرنے والی
نظروں سے شاہ بخت کو گھورتا رہا۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور خاموشی
اور آسمان سے شام کا سُرمئی اندھیرا دھیرے دھیرے اُتر رہا تھا اور
ویران سی شام کے اداس سناٹے میں شاہ بخت کی آواز یوں گونج رہی



تھی جیسے کسی اور سیارے سے آ رہی ہو۔ اس نے پوری کہانی بلا کم و کاست
سنا ڈالی، پھر وہ چپ ہو گیا۔ افروز گل بھی کچھ نہیں بولا۔ وہ ابھی تک
یقین و گمان کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ اُسے واقعی یہ معلوم تھا کہ
اس کا ایک بھائی تھا جو اس کے باپ کی پہلی بیوی سے تھا۔ مگر
اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ نیز یہ کہ یہ ساری باتیں
اس کی پیدائش سے پہلے کی ہیں۔ تاہم اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ فیروز گل
کو عین شادی کے دن قتل کیا گیا تھا اور یہ کہ ریشم در حقیقت
فیروز گل کی بیوہ ہے۔ یہ تمام باتیں اس سے نہایت ہوشیاری سے
چھپائی گئی تھیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قبیلے کے لوگوں، رشتے
داروں اور حویلی کے ملازموں نے بھی اس ضمن میں پوری احتیاط کی
تھی۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ انھوں نے شاہ بخت کے حکم کا
احترام کیا تھا۔ اب پہلی بار یہ ساری باتیں اس کے علم میں آئیں
تو اُسے ایک شدید حیرت نے گھیر لیا۔ وہ بہت دیر تک سوچتا
رہا، پھر طویل سانس لے کر بولا۔

"بابا جان! یقین نہیں آتا!"

"مگر یہ سچ ہے۔"

"کیا قاتل کا کبھی پتا نہیں چلا بابا؟"

"نہیں، حالانکہ پولیس نے پوری کوشش کی تھی۔ میں نے
بھی اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔
اس زمانے میں یہاں ایک ڈاکو ہوا کرتا تھا، شہباز۔ اس کا آئے دن کی
[illegible] واردات سے بڑا نام تھا۔ اس بنا پر عام خیال یہی ہے کہ فیروز گل کو
شہباز نے ہی قتل کیا تھا۔ یہ سترہ سال پرانی بات ہے۔ اب تو مدت
سے شہباز کا نام سننے میں نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ اب وہ مر چکا ہو۔"

اس بار پھر خاموشی۔ افروز گل کئی لمحوں تک چپ رہا اور
سوچتا رہا، پھر بولا: "شاید یہی بات ہو، مگر بابا جان! مجھ سے یہ ساری
باتیں کیوں چھپائی گئیں؟"

"کیونکہ یہ مناسب نہیں تھا۔ بچپن ہی سے تمہارے ذہن میں
بوجھ ڈالا جاتا۔"

چند لمحے توقف کے بعد افروز گل نے کہا: "تو آپ کو دوسری
شادی کا مشورہ ریشم نے دیا تھا؟"

"مشورہ نہیں، یہ تو اس کی ضد تھی۔" شاہ بخت کہنے لگا: "اور
سچ پوچھو تو میں اس کا بے حد ممنون ہوں۔ اگر وہ ضد نہ کرتی تو مجھے تم
نہ ملتے۔ مجھے تو کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے تھا۔ وہ
ریشم ضد نہ کرتی تو میں اپنے وعدے اور اصول کو توڑ کر شادی پر
رضامند نہ ہوتا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اب اس بات کو تکمیل تک
پہنچا دیا جائے، جو برسوں پہلے میرے اور ریشم کے درمیان طے
ہوئی تھی۔"

"بابا جان! مجھے تو ان باتوں کا خبر تک نہیں تھا۔ اب معلوم ہوا
ہے تو بے حد تعجب ہو رہا ہے، لیکن آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جو
بات طے ہو چکی اُسے مکمل ہونا چاہیے۔ مگر بابا جان! ریشم کی
شخصیت واقعی اونچی ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے متاثر کرتی رہی ہے مجھے
کبھی یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی غیر معمولی ہے۔"

"بیٹا!" شاہ بخت طویل سانس لے کر بڑے فخر سے بولا۔
"وہ واقعی بہت عظیم ہے۔"

اس گفتگو کے بعد شاہ بخت نے افروز گل اور ریشم کی شادی
کی تیاری شروع کر دی۔ چند ماہ بعد افروز گل کی اٹھارویں سالگرہ تھی۔
شاہ بخت نے طے کیا کہ سالگرہ کے دن ہی شادی ہونا چاہیے۔ افروز
گل کی بھی خواہش تھی کہ یہ شادی پہلی شادی سے زیادہ دھوم دھام سے
ہونا چاہیے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ شاہ بخت نے دل کے سارے ہی
ارمان نکال ڈالے۔ جہیز کی تیاری میں ہفتوں لگے۔ حویلی کے
چپے چپے کو نئے سرے سے رنگ و روغن ہوا۔ شاہ بخت نے ایک
اور احتیاط بطور خاص کی۔ اس نے مسلح محافظ رکھے اور اس
بات کا اہتمام کیا کہ افروز گل کو ایک لمحے کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑا
جائے۔ ہرچند کہ شہباز کا نام برسوں سے نہیں سنا گیا تھا اور ایسا کوئی
امکان نہیں تھا کہ کوئی اور شخص افروز گل کو نقصان پہنچانے کی کوشش
کرے گا۔ لیکن شاہ بخت ایک بار اپنا سب کچھ کھو چکا تھا، لہٰذا
دوسری بار وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اس حد
تک احتیاط کی کہ افروز گل جب شب باشی کے لیے اپنے کمرے
میں جاتا تو بھی تنہا نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم دو بندوق بردار محافظ وہاں
بھی رات بھر موجود رہتے تھے۔

شادی کی خبر عام ہوتے ہی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ لوگوں
نے تعجب کا اظہار بھی کیا اور اعتراضات بھی۔ خاص طور پر ان لوگوں
کی طرف سے زیادہ اعتراض ہوئے جن کے گھروں میں جوان لڑکیاں
تھیں اور جو افروز گل کو داماد بنانے کے سپنے دیکھ رہے تھے لیکن
شاہ بخت کی توقع کے برخلاف تعجب کے اظہار اور اعتراضات میں
اتنی شدت نہیں تھی کہ اُسے مخالفت کا نام دیا جا سکتا۔ آخر کو شاہ بخت
قبیلے کا سردار تھا اور بے حد دولت مند بھی۔ لوگ عام طور پر اس کے
فیصلوں سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں
نے اس فیصلے کو بھی بظاہر خوش دلی سے مان لیا۔

پھر شادی کا دن آ پہنچا۔ لوگوں کو فیروز گل اور ریشم کی شادی
یاد تھی کیونکہ ویسی شادی پہلے کبھی قبیلے میں نہیں ہوئی تھی۔ وہ رونق
اور ہنگامے اور دھوم دھام لوگ برسوں نہیں بھول سکے تھے۔ مگر
جب افروز گل اور ریشم کی شادی ہوئی تو لوگ پہلی شادی کو بھول
گئے۔ سارا دن حویلی میں شادیانے بجتے رہے تھے۔ مہمانوں کی
آمد و رفت جاری رہی تھی۔ ایک طرف طعام کا سلسلہ چل رہا تھا
تو دوسری طرف محفل موسیقی آراستہ تھی۔ شام ہوئی تو حویلی کا چپہ چپہ

کے بادل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اچانک نمودار ہوتے ہیں اور پل بھر میں
جل تھل کر دیتے ہیں۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ کچھ دیر پہلے بارش
کے کوئی آثار نہیں تھے۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بادلوں نے افروزگل کو
آلیا اور چاروں طرف موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ اتفاق سے
افروزگل اس وقت ایسی جگہ پر تھا کہ بارش سے بچنے کے لیے کچھ نہیں
کر سکتا تھا۔ کہیں کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ افروزگل دھیرے دھیرے
آگے بڑھتا رہا اور متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ بارش
دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی اور آثار سے پتا چلتا تھا کہ دیر تک ہوتی
رہے گی۔ بدقسمتی سے افروزگل نے ابھی نصف سے کچھ زیادہ فاصلہ ہی
طے کیا تھا۔ باقی ماندہ فاصلہ بارش میں طے کرنا مشکل تھا۔ مناسب یہی
تھا کہ کسی جگہ رک کر بارش کے رکنے کا انتظار کرے۔ مگر کہاں؟ تبھی
یکایک افروزگل کی نظر ایک چھوٹی سی جھونپڑی پر پڑی جو دائیں جانب
نشیب میں کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔ اردگرد میں
کچھ درخت تھے اور قریب ہی ایک پہاڑی نالہ۔ پہلے تو افروزگل کو
تعجب ہوا کہ اس ویران علاقے میں واقع اس جھونپڑی میں بھلا کون
رہتا ہوگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے جھونپڑی خالی ہو۔ ساتھ ہی اس
نے سوچا کہ جھونپڑی خواہ آباد ہو یا خالی بارش سے بچنے کے لیے بہت
مناسب ہے۔ یہ سوچ کر اس نے ایک مناسب سی جگہ تلاش کی اور
گھوڑا نشیب میں اتار دیا۔ بارش کی وجہ سے زمین بے حد پھسلوان
ہو گئی تھی۔ اسے بہت سنبھل سنبھل کر اترنا پڑا۔ تاہم جب وہ نیچے پہنچ
گیا تو پھر جھونپڑی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ جھونپڑی
کے ساتھ ایک چھوٹا سا چھپر بھی تھا۔ افروزگل نے چھپر کے نیچے پہنچ
کر گھوڑا روکا۔ نیچے اتر کر کپڑے جھاڑے اور پھر پریشان نظروں
سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف جل تھل ہو رہا تھا۔ بارش اتنی تیز
اور مسلسل تھی کہ بظاہر جلدی تھمتی نظر نہیں آتی تھی۔ افروزگل یہ سوچ
کر متردد ہو رہا تھا کہ اگر بارش دیر تک ہوتی رہی تو کیا ہوگا۔ کیا رات
اسی جگہ گزارنا پڑے گی۔ اسے خود اپنی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی لیکن
شاہ بخت اور ریشم کا خیال اسے زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ اگر وہ
رات بھر حویلی نہ پہنچا تو وہ لوگ کتنے پریشان ہو جائیں گے۔ بابا جان
تو یقیناً اس کی تلاش میں نوکروں کو ادھر ادھر دوڑا دیں گے۔ ریشم کو
فکر و پریشانی میں رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ افروزگل کو افسوس
ہونے لگا کہ اسے یہ غلطی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ یا تو وہ ایک ملازم
کو ساتھ لے لیتا یا پھر دن کے وقت سفر کرتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔
انجانے ہی میں سہی۔ حماقت تو ہو ہی چکی تھی۔ اب جب تک بارش نہ
رکے اسے وہاں رکنا ہوگا۔ پھر اس نے سوچا کہ بارش تھمنے پر وہ
آگے جانے کے بجائے واپس چلا جائے گا تاکہ شاہ بخت اور ریشم
زیادہ پریشان نہ ہوں۔

ابھی وہ ان خیالات میں الجھا ہوا فکرمند نظروں سے ادھر
ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ معاً اس کے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی جیسے
کوئی انسان کراہا ہو۔ اس نے چونک کر جھونپڑی کی جانب دیکھا۔ شبہ
ہوا تھا کہ آواز جھونپڑی سے آئی تھی۔ کیا کوئی اندر ہے؟ اس نے
دفعتاً سوچا اور پھر آگے بڑھا۔ جھونپڑی کا دروازہ خاصا پرانا اور شکستہ
تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر اونچی آواز میں کہا۔
"کیا کوئی اندر ہے؟"
پہلے تو خاموشی رہی۔ پھر جب افروزگل نے دوسری بار اپنا
جملہ دہرایا تو اندر سے کھانسنے کی آواز آئی اور کسی نے مدھم لہجے میں
کہا۔ "کون ہے؟"
افروزگل اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ چھوٹی سی جھونپڑی
میں ایک طرف کچھ برتن وغیرہ پڑے ہیں۔ دائیں جانب زمین
پر ایک موٹا سا گدا بچھا ہوا ہے اور اس پر ایک شخص لیٹا ہوا ہے۔
مدھم سے اجالے میں افروزگل نے دیکھا کہ وہ شخص بوڑھا، نحیف اور
بیمار نظر آتا تھا۔ اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ افروزگل نے ذرا تعجب
سے پوچھا۔ "کیا یہ تمہاری جھونپڑی ہے، تم یہیں رہتے ہو؟"
اس شخص نے فوراً کچھ نہیں کہا۔ چند ثانیے افروزگل کو دیکھتا
رہا۔ پھر مضمحل آواز میں بولا۔ "کون ہو تم؟"
"میں مسافر ہوں۔ بارش سے بچنے کے لیے یہاں آ گیا۔" افروزگل
نے جواب دیا۔ "مگر تم کون ہو۔ کیا یہاں اکیلے رہتے ہو؟"
وہ آدمی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ یکایک کھانسی اٹھی۔ وہ منہ پر ہاتھ
رکھ کر دیر تک کھانستا رہا۔ پھر کھانسی ذرا تھمی تو پھولی ہوئی سانس
کے درمیان بولا۔ "دیکھو، یہاں سرہانے ایک چراغ رکھا ہے۔ اگر
تکلیف نہ ہو تو اسے جلا دو اور مجھے ایک کٹورا پانی دے دو۔ گھڑا
اس طرف کونے میں رکھا ہے۔"
سرہانے مٹی کا ایک بکس پڑا تھا۔ چراغ اور ماچس اسی پر پڑی
ہوئی تھیں۔ افروزگل نے چراغ جلا دیا۔ پھر گھڑے سے پانی نکال
کر لایا۔ جب وہ شخص دھیرے دھیرے پانی پی رہا تھا تو افروزگل
نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک نحیف و نزار آدمی تھا۔ عمر ساٹھ
سے اوپر ہی ہوگی۔ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی جو بہت
بدنما اور غلیظ نظر آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے
تھے اور گال اندر کی جانب دھنس گئے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور
گردن میں ہلکا سا رعشہ بھی تھا۔ جب وہ پانی پی چکا تو افروزگل نے
کٹورا اس کے ہاتھ سے لیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔
"تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو؟"
"قاسم جان۔" اس نے ہاتھوں سے پانی کے قطرے پونچھتے
ہوئے جواب دیا۔ "یہی میرا نام ہے اور یہ جھونپڑی میری ہی ہے مگر



تم نے میرا نام نہیں سنا ہوگا۔"
"کیا اکیلے ہی رہتے ہو یہاں؟"
"بالکل اکیلا نہیں ہوں۔ ایک ساتھی اور بھی ہے۔ مگر وہ اکثر
دو چار روز کے لیے شہر جاتا رہتا ہے۔"
"لگتا ہے تم کچھ بیمار ہو؟"
"ہاں۔" اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی ہنسی بکھر گئی۔
"مرض پیری ہے اور اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ یہ تو بس آدمی
کو ساتھ لے کر ہی جاتا ہے۔ ویسے اس مرض کے علاوہ بھی کئی روگ
لگے ہوئے ہیں مجھے۔ کیا تمہارے پاس ایک بیڑی ہوگی؟"
"سگریٹ ہے۔" افروزگل نے کہا۔ "مجھے تمباکو نوشی کی عادت
نہیں۔ بس کبھی کبھار شوقیہ ایک آدھ سگریٹ پھونک لیتا ہوں۔"
اس نے ایک سگریٹ جلا کر بوڑھے قاسم جان کو دی۔ پھر کہنے لگا۔
"تم تو کافی بیمار لگتے ہو۔ کچھ علاج بھی کرتے ہو یا نہیں۔ کہو تو میں تمہیں
بستی میں لے چلوں؟"
"نہیں، نہیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے غور سے
افروزگل کی طرف دیکھا۔ "میں کل حکیم کے پاس گیا تھا۔ دوا لایا ہوں مگر
اب یہ دوا علاج بالکل فضول ہے۔ محض تنکے کا سہارا لینے والی بات
ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا وقت پورا ہو چکا۔ بس چند
روز کی بات اور ہے۔ پھر کوئی مرض نہیں رہے گا۔" بات ختم کرتے
کرتے وہ پھر کھانسنے لگا۔
"اتنی ناامیدی اچھی نہیں۔ تم کسی سے علاج کرو۔ مجھے امید ہے
تم اچھے ہو جاؤ گے۔"
قاسم جان استہزائی انداز میں پھر ہنسا۔ "خیر، تمہارا شکریہ۔ مگر
مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا وقت پورا ہو چکا۔"
افروزگل نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ جھونپڑی کی حالت
سے صاف ظاہر تھا کہ مکین مفلوک الحال ہو چکا تھا۔ گندے اور بدرنگ سامان
بوسیدہ کپڑے۔ ان سب کو دیکھ کر بوڑھا قاسم جان بے حد عسرت میں
زندگی گزار رہا ہے اور ہر ایک ایک چیز کو ترس رہا ہے۔
افروزگل کو یہ تعجب بھی ہو رہا تھا کہ وہ اس ویران علاقے
میں کیوں رہتا ہے جہاں کوئی پڑوسی نہیں۔ کوئی وقت ضرورت
کام آنے والا نہیں۔ جہاں انسانی صورت کو آنکھیں ترس جائیں۔ بھلا
ایسی جگہ رہنے کا کیا تک ہے۔ اس نے جھونپڑی کا جائزہ لینے کے بعد
بوڑھے قاسم جان کے ستے ہوئے چہرے کو غور سے دیکھا اور ہمدردانہ
انداز میں پوچھا۔
"تم اس ویران جگہ پر آخر کیوں رہتے ہو۔ یہاں تو تمہیں اکثر
بڑی پریشانی ہوتی ہوگی؟"
"نہیں، کچھ ایسی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔" قاسم جان نے

سگریٹ کا کش لیا۔ "عادت کی بات ہے۔ میں ہمیشہ ہی آبادیوں
سے الگ تھلگ پہاڑیوں میں رہا ہوں۔ اب عادت ہو گئی ہے۔
یہ خاموشی اور تنہائی اب اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور باتیں
بھی ہیں۔ جنہیں بیان کرنے کا موقع نہیں۔ مگر تم نے میری بات
کا جواب نہیں دیا۔"
"کون سی بات کا؟" افروزگل نے تعجب سے پوچھا۔
"جب تم اندر آئے تھے۔ تبھی میں نے پوچھا تھا کون
ہو تم؟"
"میرا نام افروزگل ہے اور میں سردار شاہ بخت کا بیٹا ہوں۔
تم سردار شاہ بخت کو تو جانتے ہوگے نا؟"
قاسم جان نے سنا، چونک کر افروزگل کی جانب دیکھا۔ کئی
لمحے تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دو تین بار سر کو جھٹکا اور زور
زور سے سانسیں لینے لگا۔ افروزگل اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا
مگر یہ اندازہ کرنے سے قاصر تھا کہ قاسم جان کی یہ حالت کس بنا پر
ہوئی ہے۔ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔
"کیا بات ہے قاسم جان! تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے ہو؟"
قاسم جان نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ "جب تم اندر آئے
تھے تبھی میں نے خیال کیا تھا کہ تم کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے کیونکہ
صورت جانی پہچانی سی لگی تھی۔ دو چار مرتبہ تمہیں دیکھ چکا ہوں۔
سردار شاہ بخت سے بھی واقف ہوں۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ۔
تمہارے قبیلے کو اس سے اچھا سردار کبھی نہیں ملا۔"
"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر تم میرا نام سن کر کچھ پریشان ہو گئے
تھے۔ آخر کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"
"نہیں، نہیں، کوئی ایسی بات نہیں ہے۔" قاسم جان نے منہ
دوسری طرف پھیر لیا۔ "دراصل مجھے کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ سردار
شاہ بخت کا بیٹا اس طرح اچانک میرے جھونپڑے میں
آ جائے گا۔"
"تو کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟" افروزگل نے پوچھا۔
"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" قاسم جان نے پھر گردن
گھمائی اور افروزگل کو دیکھنے لگا۔ اس کے بوڑھے استخوانی چہرے
پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اندر ہی اندر شدید کشمکش میں مبتلا ہو
گیا ہو۔ جیسے اسے کسی بات نے اچانک بے حد پریشان کر دیا ہو۔
اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں خوف اور الجھن ایک ساتھ نمایاں
تھی۔ افروزگل کو بہت تعجب ہوا۔ آخر ایسی کیا بات ہے کہ بوڑھا
قاسم جان اتنا پریشان ہو گیا ہے۔ اس نے چند ثانیے غور کر کے پوچھا۔
"اگر میری یہاں آمد سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے تو میں
معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آخر ایسی کیا بات ہے کہ تم میرا نام سن کر اتنے

پریشان ہو گئے ہو؟"

قاسم جان نے اضطرابی انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیری اور زور زور سے کئی سانسیں لیں۔ اُس کے بشرے اور آنکھوں کے تاثرات سے پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تاہم کوئی بات اُسے روک رہی ہے۔ یہ اضطرابی کیفیت کئی لمحے تک رہی تھی پھر وہ بے چین ہو کر بڑبڑانے لگا: "اوہ خدایا! یہ کیا ہوا۔ آخر یہ دن میری زندگی میں کیوں آنا تھا۔ کیا ضرورت تھی اس کی۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کیا ہرج تھا۔ کیا فرق پڑتا تھا میرے خدا! میں کیا کروں؟" وہ تیز اور تیکھی نظروں سے افروز گل کو گھورنے لگا: "کیا ضرورت تھی تمھیں یہاں آنے کی۔ میں اتنا بیمار ہوں۔ آسانی سے چل پھر بھی نہیں سکتا۔ بس کچھ ہی سانسیں باقی رہ گئی ہیں میری۔ سوچا تھا یہاں اس ویرانے میں چپکے سے مر جاؤں گا اور پھر سب کچھ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گا مگر اب تم آ گئے ہو۔ کیوں آئے ہو؟ کیا وہ اوپر والا مجھے سکون سے مرنے بھی نہیں دے گا۔ اب میں کیا کروں۔۔۔" کہتے کہتے قاسم جان کی سانس پھول گئی اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس بار کھانسی کا حملہ اتنا شدید تھا کہ قاسم جان کی حالت غیر ہو گئی۔ اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں، آنکھیں سرخ ہو گئیں اور سینہ دھونکنی کی طرح ابھرنے پچکنے لگا۔ افروز گل یہ دیکھ کر قدرے گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے پانی کا کٹورا قاسم جان کے ہونٹوں سے لگایا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"لو پانی پیو، قاسم جان! اس سے تمھیں سکون ملے گا۔"

قاسم جان نے دو تین گھونٹ پانی پیا تو کھانسی ختم ہو گئی مگر وہ کئی منٹ تک لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ جب ذرا حواس بحال ہوئے تو اس نے احسان مندی سے افروز گل کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولا: "شکریہ۔"

لمحہ بھر توقف کے بعد افروز گل نے کہا: "قاسم جان! میں تمھاری باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ آخر کیا بات ہے کہ تم اتنے پریشان ہو گئے ہو۔ اگر میری یہاں موجودگی تمھارے لیے باعث پریشانی ہے تو میں چلا جاتا ہوں لیکن کیا مناسب نہ ہو گا کہ جو بات تمھیں پریشان کر رہی ہے، وہ مجھے بتا دو۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح تمھارے دل و دماغ کو سکون ملے گا۔"

قاسم جان نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیرے دھیرے سانس لیتا رہا۔ الجھن اور تذبذب کے آثار بدستور اس کے چہرے پر چھائے تھے۔ افروز گل نے چند لمحے انتظار کیا پھر دھیرے سے بولا۔

"اگر میری یہاں آمد یا میری کسی بات سے تمھیں تکلیف پہنچی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ اب میں جاتا ہوں۔ تم اپنے دل کا حال مجھے نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ تاہم اگر تمھیں میری مدد کی ضرورت ہو، اب یا آئندہ کبھی، تو تکلف نہ کرنا۔ مجھے تمھاری مدد کر کے خوشی ہو گی۔ اچھا خدا حافظ۔"

وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ باہر نکلتا، قاسم جان نے یکایک کہا: "ٹھہرو۔"

"کیا بات ہے؟"

"یہاں آؤ۔"

افروز گل واپس آ کر پھر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا، اور استفہامیہ نظروں سے قاسم جان کو دیکھنے لگا۔ قاسم جان کچھ دیر خاموش رہا، پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑانے لگا: "تم نے مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کروں، خاموش رہوں یا سب کچھ کہہ دوں۔ دل پر کسی راز کا بوجھ ہو تو اس سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہوتا۔ آدمی کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ میں نے اٹھارہ انیس سال خاموش رہ کر گزارے ہیں۔ اگر دو چار دن اور گزر جاتے تو کیا ہرج تھا مگر اب تم آ گئے ہو۔ شاید یہ بھی قدرت کی طرف سے ہے ورنہ تم کیوں آتے۔ کیا واقعی یہ قدرت کی منشا ہے کہ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں سب کچھ، جو میرے سینے میں اٹھارہ انیس سال سے دفن ہے۔ او میرے خدا! میں کیا کروں، میں کیا کروں؟"

"مناسب یہی ہے کہ سب کچھ کہہ دو۔" افروز گل نے نرمی سے کہا: "اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ اذیت دینے سے کیا فائدہ۔ ممکن ہے اسی میں قدرت کی کوئی مصلحت ہو، ورنہ میرا یہاں آنا کیوں ہوتا اور تم سے ملاقات کیوں ہوتی۔"

"ہاں، شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" قاسم جان نے زور زور سے کئی سانسیں لیں، پھر جلتی ہوئی آنکھوں سے افروز گل کو گھورا۔

"تمھارا نام افروز گل ہے؟"

"ہاں، میں بتا چکا ہوں۔"

"اور تمھاری بیوی کا نام ریشم خانم ہے۔"

"ہاں۔" افروز گل نے جواب دیا: "وہ بہت اچھی ہے۔ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے اور اب تو ہمارا ایک بیٹا بھی ہے عزم خان۔"

قاسم جان افروز گل کی بات نظر انداز کر کے بولا: "اور تمھارا ایک بڑا بھائی تھا، فیروز گل، جو شاہ بخت کی پہلی بیوی سے تھا لیکن کیا یہ تمھیں معلوم ہے کہ ریشم خانم کی شادی پہلے فیروز گل سے ہوئی تھی؟"

"ہاں، مجھے یہ ساری باتیں معلوم ہیں۔" افروز گل متعجب ہو کر بولا۔ "مگر تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہو؟"

قاسم جان چند لمحے چپ رہا اور بہت غور سے افروز گل کو دیکھتا رہا۔ اس کے بشرے سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنی اندرونی کشمکش پر قابو پانے کی شدید کوشش کر رہا ہے۔ پھر اس نے آہستہ



سے کہا: "افروز گل! کیا تم جانتے ہو کہ فیروز گل کی موت کب اور کس طرح ہوئی تھی؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ فیروز گل کو عین شادی کی رات ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا۔ اس زمانے میں ایک ڈاکو ہوتا تھا، شہباز، یہ کام اسی کا تھا۔"

"شہباز ڈاکو۔" قاسم جان کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی: "ہاں میں جانتا ہوں، تمھاری بستی میں بس لوگ یہی کہتے تھے اور یہی سمجھتے تھے۔ لیکن یہ سچ نہیں۔ شہباز ڈاکو اس واقعے سے پہلے ہی غائب ہو گیا تھا۔ کسی کو علم نہیں کہ وہ مر گیا یا کہیں چلا گیا۔ بہر حال تمھارے بھائی کے قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ یہ قتل تو دوسرے لوگوں نے باقاعدہ منصوبے اور سازش کے تحت کیا تھا۔"

افروز گل اچانک ٹھٹک کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ قتل دوسرے لوگوں نے کیا تھا؟"

"ہاں۔"

"کن لوگوں نے؟"

قاسم جان نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر اپنے جسم کو سمیٹا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر بلغم زدہ آواز اور کمزور لہجے میں کہنے لگا: "اب میں نے زبان کھولی ہے تو تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ ممکن ہے میرا یہ فعل نیکی میں شمار ہو اور معبود میرے کچھ گناہوں کو معاف کر دے، ہر چند کہ میں مستحق نہیں۔ بہت بُرا آدمی ہوں۔ ساری زندگی برائیوں میں گزاری ہے جن میں سے ایک برائی یہ ہے کہ مجھے فیروز گل کے قتل کی حقیقت معلوم ہے لیکن اس راز کو اپنے سینے میں انیس سال تک چھپائے رہا۔ خیر تو میں اب تمھیں سب کچھ بتاتا ہوں۔ مگر تم درمیان میں مت بولنا۔ بس خاموشی سے سنتے رہنا۔ تم سردار بختیار کو جانتے ہو، وہ تمھارے بہت قریب رہتے تھے۔ تم نے سردار سکندر کا نام بھی ضرور سنا ہو گا۔ ان کو تین چار سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ وہ سردار بختیار کے بہت گہرے دوست تھے لیکن تیسرے شخص کا نام تم نے نہیں سنا ہو گا۔ یہ ایک کمینہ خصلت آدمی تھا اور فیروز گل کے قتل میں انھی تینوں کا ہاتھ تھا۔"

"مگر کیوں؟ آخر یہ تینوں فیروز گل کو کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟" افروز گل نے مضطرب ہو کر کہا۔

"تینوں نہیں، صرف سردار بختیار۔ سردار سکندر اور فقیر شاہ نے اس کی مدد کی تھی۔ مگر تم خاموش رہو تو مجھے پورا واقعہ بیان کرنے میں آسانی ہو گی۔ تم غالباً اس بات سے واقف ہو گے کہ سردار بختیار ایک لالچی اور کینہ پرور آدمی ہے اور شروع ہی سے وہ اپنے دل میں شاہ بخت کے خلاف عناد رکھتا ہے۔ تمھیں یہ بھی علم ہے کہ اس کی بیٹی جہاں بیگم ہے جس کی شادی سردار سکندر کے بھانجے سے ہوئی ہے۔ مگر یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب فیروز گل کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت سردار بختیار اپنی بیٹی جہاں بیگم کی شادی فیروز گل سے کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ شاہ بخت کی تمام دولت اور جائداد پر قبضہ کر سکے گا۔ لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ شاہ بخت نے فیروز گل کی شادی ریشم سے طے کر دی۔ قدرتاً سردار بختیار کو اس فیصلے سے شدید تکلیف پہنچی کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ ایک خود غرض، لالچی اور منتقم مزاج رکھنے والا آدمی ہے اور اپنی ہار کو آسانی سے برداشت نہیں کرتا، خاص طور پر ایسی کوئی بات تو وہ برداشت کر ہی نہیں سکتا جس میں اسے ذلت کا احساس ہو۔ جہاں بیگم سے فیروز گل کی شادی کی تجویز شاہ بخت نے معذرت کے ساتھ نامنظور کی تھی تو سردار بختیار نے اسے اپنی بے عزتی تصور کیا تھا۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا کہ وہ شاہ بخت سے اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔ پھر اس نے اس بات کا تذکرہ سردار سکندر سے کیا۔ سردار سکندر فوراً سردار بختیار کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا کیونکہ سردار سکندر خود بھی شاہ بخت سے نفرت کرتا تھا۔ ماضی میں کچھ ایسے مواقع آئے تھے جب سردار سکندر کو شاہ بخت کے مقابلے میں ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب سردار بختیار نے اپنے احساسات سردار سکندر سے بیان کیے تو اس نے سوچا کہ یہ موقع اچھا ہے، اس طرح وہ خود بھی شاہ بخت سے اپنی گزشتہ شکستوں کا بدلہ لے سکے گا۔ چنانچہ دونوں دوست سر جوڑ کر بیٹھے اور اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر سوچ بچار کرنے لگے۔ ان کے درمیان یہ بھی طے ہوا کہ شاہ بخت سے بدلہ لینے کے بعد کس کو کیا ملے گا۔ سردار بختیار کو قبیلے کی سرداری کے علاوہ شاہ بخت کی تمام جائداد اور دولت ملے گی جبکہ سردار سکندر کو سردار بختیار نے ایک خطیر رقم دینے کا وعدہ کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ جب شاہ بخت کی تمام دولت اور جائداد سردار بختیار کو مل جائے گی تو جہاں بیگم کی شادی سردار سکندر کے بھانجے سے کر دی جائے گی اور جائداد کا ایک معقول حصہ جہیز میں دلہن کو دے دیا جائے گا۔"

قاسم جان سانس لینے کے لیے رکا تو افروز گل نے بے چین ہو کر پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

"میں بتا رہا ہوں، تم ذرا صبر و سکون سے سنتے رہو۔" قاسم جان کہنے لگا: "سردار بختیار اور سردار سکندر نے اس معاملے پر بہت غور کیا اور آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ شاہ بخت سے بدلہ لینے کا سب سے بہتر طریقہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ فیروز گل کو قتل کر دیا جائے کیونکہ تمھیں اپنے قبیلے کے رواج اور روایات کے قانون کا علم ہو گا، اس قانون کے تحت وراثت تقریباً طے شدہ تھی کہ اگر فیروز گل مر جائے

گزارہا اور بدصورت پہاڑیاں، ویران آسمان اور لعن کی صورت میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے سفید بادل کے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ مگر اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کا ذہن ایک وسیع و عریض قبرستان بن گیا ہے۔ جس میں بے شمار قبریں ہیں — لیکن ہر قبر کے کتبے پر صرف ایک ہی نام لکھا ہے۔ فیروز گل۔ اُس کا اَن دیکھا بھائی جسے ایک کمینے، خود غرض اور سنگ دل آدمی نے صرف اِس لیے قتل کرادیا تھا کہ اُس کے باپ کی دولت، جائیداد اور قبیلے کی سرداری پر قبضہ کرسکے۔ کیسی عجیب بات ہے، کیا ایسا بھی ہوتا ہے اِس دنیا میں؟ اگر ہوتا ہے تو پھر مقدس ناتوں کی حرمت کیا چیز ہے۔ شرافت اور انسانیت کسے کہتے ہیں۔ ایمان کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ سب محض کتاب میں لکھے ہوئے لفظ ہیں۔ کیا سارے اور فریب کار ہیں۔ افروز گل کو اس وقت جتنا رنج تھا، جتنا غصہ تھا، اتنا ہی تعجب بھی ہو رہا تھا۔ آدمیت، نیکی اور شرافت کے وہ سارے معیار جو اُس کے ذہن میں قائم تھے، ایک ایک کرکے ٹوٹ رہے تھے، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے اور یہ احساس اتنا شدید تھا کہ چند ہی منٹ میں افروز گل کا دم گھٹنے لگا۔ اُس نے وحشت زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پلٹ کر جھونپڑی کے بند دروازے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر گھوڑے کی طرف بڑھ گیا گھوڑے کی راس تھامتے ہوئے اچانک اُس نے اونچی آواز میں کہا۔

"سردار بختیار برسوں پہلے جو جرم تم نے کیا تھا اب اُس کا حساب دینے کا وقت آگیا ہے۔"

جب وہ حویلی میں پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ حویلی میں ہر طرف شمع دان روشن تھے۔ ملازم اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن افروز گل نے کسی طرف توجہ نہیں دی۔ کسی سے بات بھی نہیں کی۔ گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ کمرہ نچلی منزل کے عقبی حصے میں تھا۔ افروز گل نے دریچہ کھول دیا اور چوکھٹ پر کہنیاں ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ بادل اب چھٹ گئے تھے اور چاند نکل آیا تھا اور مدھم دودھیا چاندنی میں دُور تک پھیلی ہوئی پہاڑیاں ایک آسیبی خواب کی طرح لگ رہی تھیں۔ کئی منٹ تک وہ خاموش کھڑا پہاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر آہٹ سُن کر اس نے گردن گھمائی تو دیکھا کہ ریشم کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ ریشم کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس وقت اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

ریشم نے مسکرا کر محبت سے پوچھا۔ "بہت جلد لوٹ آئے حالانکہ وہ بستی تو یہاں سے کافی دُور ہے۔"

"میں وہاں نہیں گیا۔ راستے ہی سے لوٹ آیا۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟" افروز گل نے زیرِ لب اس لفظ کو دہرایا۔ اور اس کا دل چاہا کہ وہ ریشم کو سب کچھ بتادے۔ پوری کہانی بیان کرکے اسے بتادے کہ حقیقت کیا ہے لیکن افروز گل ضبط کر گیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ سوچا، ابھی نہیں۔ مناسب وقت آنے پر وہ سب کچھ بتائے گا۔ ریشم کو بھی اور دا جان کو بھی۔ اور انہیں یہ بھی بتلائے گا کہ اپنے بے گناہ بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے وہ خود کیا کرنے والا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی زبان کو روک لیا۔ ایک طویل سانس لے کر دھیرے سے بولا۔

"بارش کی وجہ سے دل نہیں چاہا، اس لیے واپس آگیا۔"

"اچھا۔" ریشم نے کہا اور اس کی جانب دیکھا اور تب اس وقت پہلی بار ریشم کو افروز گل کی متغیر حالت کا احساس ہوا۔ افروز گل کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور آنکھیں یوں ویران ویران سی لگ رہی تھیں جیسے وہ بہت بیمار ہو یا کسی اندرونی تکلیف میں مبتلا ہو۔ ریشم نے فکرمند ہو کر کہا۔ "کیا بات ہے تم بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں، تم فکر نہ کرو۔"

"تو پھر یہ چہرہ کیوں اُترا ہوا ہے۔ لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ کہو تو حکیم کو بلوا لوں؟"

"نہیں، نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" افروز گل جلدی سے بولا۔ "تم بلاوجہ پریشان نہ ہو، میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سر میں گرانی ہے۔ تم مجھے قہوے کی ایک پیالی بنوا دو۔ پی کر سو جاؤں گا تو صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

### شیر اور گھاس

حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے منصف مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم نے اپنے یہاں ایک [illegible] بزم شعر و [illegible] کا انتظام کیا۔ مدعو شعرا میں جوش ملیح آبادی بھی شامل تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر مولانا نے تمام شاعروں کو کھانے کی دعوت دی اور جب [illegible] جوش صاحب کے سامنے لائی گئی تو وہ مولانا کی عظمت سے مرعوب ہونے کے باوجود بڑی بے بسی سے کہنے لگے۔

"معاف کیجیے مولانا! یہ تو گھاس کی دعوت ہے۔"



مگر اس رات افروز گل کو بالکل نیند نہیں آئی۔ ساتھ والے پلنگ پر ریشم آرام سے سو رہی تھی مگر وہ جاگتا رہا اور کھلے دریچے سے نظر آسمان کو دیکھتا رہا۔ بار بار اس کے تصور میں بوڑھے قاسم جان کا چہرہ اُبھرتا اور اس کی بلغمی آواز کانوں میں گونجتی اور اس کے ذہن کی فضا میں کھنچنے لگتیں۔ فیروز گل کے قاتل سردار بختیار، سردار سکندر، ہاشم گل اور فقیر شاہ تھے۔ پھر ایک سوال اُس کے سامنے آکھڑا ہوتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا وہ شاہ بخت کو سب کچھ بتادے یا خود کوئی قدم اٹھائے یا خاموش رہے؟ وہ ساری رات اپنے آپ سے اُلجھتا رہا اور اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا۔ مگر اسے جواب نہیں ملا۔ حتیٰ کہ ساری رات گزر گئی اور پھر صبح کے قریب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ افروز گل مسلسل ایک ادھیڑ بن میں مبتلا رہا۔ ایک مستقل کرب، ایک مسلسل اذیت اُسے گھیرے رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اُس کے معمولات میں بھی بڑا فرق پڑ گیا تھا۔ زیادہ تر حویلی سے باہر رہتا اور جب حویلی میں ہوتا بھی تو اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ شاہ بخت سے زیادہ سامنا نہیں ہوا۔ لیکن ریشم نے اُس کی مسلسل خاموشی اور پریشان کن کیفیت کو محسوس کیا اور کئی بار استفسار بھی کیا لیکن افروز گل کسی نہ کسی طرح ٹال گیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ جب تک خود اس کا اپنا ذہن کسی نتیجے پر نہ پہنچ جائے تب تک وہ کسی سے اصل بات بیان نہ کرے لیکن اُس کا ذہن کس نتیجے پر پہنچے گا؟ کیا کرے گا وہ؟ کون سا قدم اُٹھائے گا؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا کوئی جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ جتنا وہ سوچتا، اُتنا ہی اُس کے ذہنی کرب و اذیت میں اضافہ ہوتا۔ دماغ کی رگیں کھنچنے لگتیں اور وہ گھبرا کر حویلی سے باہر نکل جاتا۔

چند دن کے بعد ایک روز وہ پھر قاسم جان کی جھونپڑی میں جا پہنچا۔ مگر قاسم جان وہاں نہیں تھا۔ وہ اپنے تمام کنبے سمیت اس دنیا سے جا چکا تھا۔ یہ اطلاع افروز گل کو اس کے ساتھی سے ملی۔ وہاں سے افروز گل نے گردوں میں نجیب شاہ کا رُخ کیا۔ وہ [illegible] تلاش کرنے میں اُسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ جس کا ذکر قاسم جان نے کیا تھا۔ عنایت تھے [illegible] پھر ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ موٹے کپڑوں اور ٹاٹ کے پردے [illegible] عنایت افروز گل کو بے حد عجیب لگا۔ اُس کا سارا جسم داغ دار ہو چکا تھا۔ زخموں سے خون اور پیپ رستی تھی اور بدبو کے بھبکے اُٹھتے تھے اور وہ اتنا بدشکل اور غلیظ تھا کہ کوئی بھی آدمی اس کے قریب بیٹھنا پسند نہیں کر سکتا تھا۔ جب افروز گل نے اپنا تعارف کرایا اور آمد کا مقصد بیان کیا تو اُس نے صاف انکار کر دیا کہ فیروز گل کے قتل کے بارے میں وہ کوئی بات جانتا ہے — تاہم جب افروز گل نے اُسے ذلت کا اور قاسم جان کا حوالہ دیا تو وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ ہو گیا۔

پھر اس نے کہانی بیان کی اور پوری کہانی لفظ بہ لفظ وہی تھی جو قاسم جان نے بیان کی تھی۔ کہیں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ افروز گل کے ذہن میں اگر پہلے کوئی شک و شبہ تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ یہ ناممکن تھا کہ قاسم جان کے بعد عنایت بھی فیروز گل کے قتل کی داستان بالکل اسی طرح سناتا، جس طرح قاسم جان نے سنائی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ دونوں ہی سچ کہہ رہے تھے، ویسے بھی انہیں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ عنایت نے پوری کہانی بیان کرنے کے بعد کہا۔

"موت کا خوف بہت بُری بلا ہے۔ میں نے اسی خوف سے آج تک زبان نہیں کھولی اور شاید اب بھی نہ کھولتا مگر اب تم آگئے ہو تو یہ بھید ہو گیا۔ ویسے بھی اب میری حالت ایسی ہے کہ سردار بختیار مجھے قتل کرنے کے لیے میرے پاس آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تم تو واقعی بڑے دل گردے والے آدمی ہو کہ اتنی دیر سے میرے پاس بیٹھے ہو۔ مگر یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کرو گے؟"

افروز گل نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کرے گا ضرور۔ وہ نہ بزدل تھا، نہ بے غیرت اور نہ بے حس۔ اس کے سینے میں دل بھی تھا اور رگوں میں گرم لہو بھی دوڑتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی روایات سے بھی واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ خاموش رہا تو اس کا ضمیر اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ ساری عمر وہ پشیمانی کی آگ میں جلتا رہے گا۔ اس کے بھائی کے قاتل اس کی نظروں کے سامنے موجود رہیں گے اور وہ بے غیرتی سے انہیں دیکھتا رہے گا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ حرص اور حصولِ زر کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ سردار بختیار کو قبیلے کی سرداری اور شاہ بخت کی دولت کا لالچ اگر کل تھا تو آج بھی ہوگا اور کل بھی رہے گا اور اس کے بعد یہ لالچ ہاشم گل کو منتقل ہو جائے گا کیونکہ سردار بختیار کی بیٹی کے تعلق سے وراثت کا یہ حق اسے پہنچتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اس کی اپنی زندگی اور اس کے بیٹے عزم خان کی زندگی بھی ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ حرص و ہوس اور کمینگی کے اس سلسلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس طرح کہ وہ اپنے بھائی کے خون کا بدلہ بھی لے لے۔ مگر وہ کیا کر سکتا ہے؟ کئی صورتیں ہیں، جن میں سے کسی ایک پر وہ عمل کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ عنایت ابھی زندہ ہے۔ اُس کی شہادت کافی ہوگی۔ تاہم اس کی کیا ضمانت ہے کہ عنایت گواہی دے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ شاہ بخت کو سب کچھ بتادے۔ شاہ بخت خود ہی سردار بختیار سے اپنے تمام حساب برابر کرے گا اور تیسرا راستہ یہ ہے کہ وہ خود کے

کسی نہ کسی طرح برداشت بھی کیا ہے۔ لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ میں خاموش نہیں بیٹھوں گا۔ اگر تم نے افروز گل کو میرے حوالے نہیں کیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یا تو خود مٹ جاؤں گا یا تمہارے خاندان کا نام و نشان مٹا دوں گا۔"

شاہ بخت نے زور سے سانس لی۔ "سردار بختیار!" اُس نے کہا۔ اُس کے لہجے سے تھکاوٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔ "دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں۔ میں قبیلے کا سردار ہوں اور اگر افروز گل کے بارے میں تمہارا الزام درست ہے تو فیصلہ میں خود کروں گا۔ مجرم کو اُس کے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔ تاہم سوال یہ ہے کہ افروز گل کہاں ہے؟ وہ صبح حویلی سے گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا ہے۔"

"تو پھر کہاں ہے وہ؟"

"میں نہیں جانتا۔" شاہ بخت نے جواب دیا۔ "مگر میں خود بھی یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ افروز گل نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ کیا وجہ تھی کیا اس کا ہاشم گل سے جھگڑا ہوا تھا یا کوئی اور بات تھی۔ کوئی شخص بلاوجہ تو کسی کو قتل نہیں کرتا۔"

"مجھے اس ضمن میں کچھ بھی علم نہیں۔ اس کا جواب تو افروز گل ہی دے سکتا ہے۔" سردار بختیار نے کہا۔

"مگر وہ یہاں نہیں آیا۔" قدرے توقف کے بعد سردار مُراد نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ وہ کوثر کو ساتھ لے گیا ہے۔ اس صورت میں ہمیں فوراً اُسے تلاش کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی نامناسب بات ہو جائے۔" پھر سردار مُراد نے شاہ بخت کی طرف دیکھا۔ "مگر ہم اُسے کہاں تلاش کریں گے؟"

اسی اثناء میں حویلی کے کئی افراد بھی وہاں آ گئے تھے۔ ان میں ریشم بھی شامل تھی۔ وہ شاہ بخت کے پیچھے کھڑی تھی اور اس دوران بالکل خاموش رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اُس کے اندرونی احساسات صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ یقین اور بے یقینی کی ایک کرب انگیز کشمکش۔ جیسے اُسے شبہ ہو کہ جو کچھ اس نے سُنا، وہ واقعی سچ ہو سکتا ہے۔ مگر کیوں اور کیسے؟ افروز گل تو ایسا آدمی نہیں۔ وہ تو بہت حلیم اور خوش مزاج ہے، نرم دل ہے۔ تشدد پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔ پھر یہ قدم اُس نے کیسے اٹھایا۔ ہاشم گل کا قتل اور کوثر کا اغوا کوئی معمولی اقدامات تو نہیں۔ کہیں یہ سب جھوٹ ہی نہ ہو۔ کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہ ہو۔ مگر اس بات کا پتا تو جبھی چل سکتا ہے جب افروز گل ملے اور اُس کا بیان بھی سُنا جائے۔ اُس نے یکایک شاہ بخت کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے بولی۔

"بابا جان! میرا خیال ہے وہ کاریز میں ہو گا۔"

شاہ بخت نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ "کاریز میں! کیا تمہیں یقین ہے؟"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ شاید وہ وہاں گیا ہو۔"

شاہ بخت نے ایک لمحہ غور کیا۔ پھر اُس نے سردار مُراد سے کہا۔ "سردار مُراد! میں حیران ہوں کہ کیا کہوں، کیا کروں۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں ایسا وقت بھی آئے گا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ افروز گل ایسی حرکت کیوں کرے گا۔ لیکن یہ طے ہے کہ اصل حقیقت جاننے کے لیے اُسے تلاش کرنا ضروری ہے۔ میں چند آدمیوں کو مختلف مقامات پر دوڑاتا ہوں اور ہم لوگ خود کاریز کی طرف چلتے ہیں۔ شاید وہ وہاں گیا ہو۔"

کچھ ہی [illegible] جھرنے سے کچھ فاصلے پر شاہ بخت نے ایک کاریز بنایا تھا۔ اُس [illegible] بالکل نہیں تھی۔ شاہ بخت اور افروز گل کبھی کبھی وہاں کچھ وقت سکون اور تنہائی میں گزارنے کے لیے چلے جاتے تھے چونکہ فاصلہ زیادہ نہیں تھا اس لیے جیپوں اور گھوڑوں کے ذریعے وہاں پہنچنے میں [illegible] دیر نہیں لگی۔ تاہم یہ الگ بات ہے کہ شاہ بخت کو وہ فاصلہ [illegible] محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے ایک عمر کا فاصلہ طے کیا ہو۔ ایک قیامت سے دوسری قیامت تک چلا ہو۔ وہ ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ اُس کا ذہن یقین و شک کے درمیان معلق تھا۔ کیا سردار بختیار سچ کہہ رہا ہے؟ اگر سچ کہہ رہا ہے تو افروز گل نے ایسا کیوں کیا؟ پھر یہ بھی ہے کہ اگر یہ الزام درست ہے تو وہ کیا کرے گا۔ کیسے سچ کا سامنا کرے گا۔ بے شک وہ قبیلے کا سردار ہے۔ لیکن ایک باپ بھی تو ہے۔ افروز گل اس کا بیٹا ہے جسے اس نے فرزند گل کو کھو کر پایا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اور پل پل دعائیں مانگ مانگ کر اس نے اسے پالا ہے۔ مگر اب اُسی بیٹے پر الزام ہے۔ قتل اور اغوا جیسا سنگین الزام۔ اور اگر یہ الزام ثابت ہو گیا تو اُسے باپ کا چہرہ اُتار کر سردار کا چہرہ پہننا پڑے گا اور فیصلہ کرنا پڑے گا . . . فیصلہ . . . اور فیصلہ کیا ہو گا؟ یہ اُسے خوب ہی معلوم تھا مگر وہ کس دل سے فیصلہ کرے گا۔ تلوار کی دھار پر چلنا آسان تو نہیں ہوتا۔ رگیں کٹ جاتی ہیں، پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں کیونکہ تلوار کی دھار بڑی غیر جانب دار ہوتی ہے۔ وہ کسی رشتے کو نہیں مانتی، کسی جذبے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اُس کا تو کام کاٹنا ہے، سو وہ کاٹ دیتی ہے۔ کیا شاہ بخت کے پاؤں بھی کٹ جائیں گے؟

قیامت سے قیامت تک کا فاصلہ انجام کار طے ہو گیا۔ وہ کاریز کے سامنے پہنچ گئے۔ کاریز کے عقب میں اونچی پہاڑیاں تھیں۔ دائیں طرف کچھ فاصلے پر جھرنا تھا جس کا شور یہاں تک پہنچ رہا تھا۔ اطراف میں ویرانی مسلط تھی اور آثار سے پتا نہیں چلتا تھا کہ کاریز میں کوئی ہے۔ وہ کاریز سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ پھر شاہ بخت اور ریشم اور سردار مُراد جیپ سے اترے۔ شاہ بخت کا



ارادہ تھا کہ اکیلے ہی کاریز میں جائے گا لیکن قبل اس کے کہ وہ آگے بڑھتا، یکایک ایک اونچی آواز آئی۔

"ٹھہرو!"

آواز افروز گل کی تھی اور یقیناً کاریز سے ہی آئی تھی۔ وہ چونک کر کاریز کی جانب دیکھنے لگے۔ اس اثناء میں سردار بختیار جیپ سے اُتر کر اُن کے قریب آ گیا تھا۔ اُس نے افروز گل کی آواز سنی تو نفرت اور غصّے سے چیخ کر بولا۔ "وہ کم بخت، ذلیل اندر ہے یقیناً کوثر بھی اُس کے ساتھ ہو گی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جان سے مار ڈالوں گا۔" پھر وہ زور سے چلایا۔ "افروز گل! باہر نکلو۔" یہ کہتے کہتے اُس نے بندوق سیدھی کر لی۔

سردار مُراد نے فوراً اُس کی بندوق کی نال تھام کر نیچے کی جانب موڑ دی اور غصّے سے بولا۔ "سردار بختیار! میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں کہ خود پر قابو رکھو۔ ورنہ نتائج کے ذمّے دار تم خود ہو گے۔ میں بہت دیر سے ضبط کر رہا ہوں۔ تم اور زیادہ میرا اور شاہ بخت کا امتحان مت لو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" سردار بختیار برافروختہ ہو کر بولا۔

"مطلب یہ کہ افروز گل کو گولی مارنے کا تمہیں کوئی حق نہیں۔ اگر افروز گل مجرم ہے تو اس کا فیصلہ سردار شاہ بخت کرے گا۔ تم اپنی زبان بند رکھو۔" سردار مُراد نے بات پوری کی اور غصّے سے سردار بختیار کی بندوق چھین لی۔ پھر کاریز کی طرف رُخ کر کے اونچی آواز میں بولا۔

"افروز گل! کیا تم اندر ہو؟"

چند لمحے بعد آواز آئی۔ "ہاں۔"

"اور کیا کوثر بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

"ہاں ہے۔"

"[illegible] میرا مشورہ ہے کہ تم باہر آ جاؤ۔" سردار مُراد نے بلند آواز [illegible] کہا۔ "تم یقیناً یہ سمجھ گئے ہو گے کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ [illegible] ہاشم گل کے قتل اور کوثر کے اغوا کا الزام ہے۔ نیز تم نے [illegible] کو بھی زخمی کیا ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم کوثر کو ہمارے حوالے کر دو۔ [illegible] وہ ایک سنگین جرم ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم نے ایسا [illegible] بہر حال اب تم ہتھیار ڈال دو اور قبیلے کی روایات کے مطابق شاہ بخت کو [illegible] ذمّے داری نبھانے کا موقع دو۔ کیا تم میری باتیں سُن رہے ہو؟"

افروز گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک گہری خاموشی مسلط رہی۔ پھر شاہ بخت نے زور سے کہا۔

"افروز گل! تم خاموش کیوں ہو۔ اگر تم [illegible] کے اندر اندر باہر نہ نکلے تو میں کاریز میں آ [illegible] تم نے پہلے ہی کئی مشکلیں کھڑی کر دی [illegible]

سُن لیا تم نے . . . میں اندر آ رہا ہوں۔"

"نہیں بابا جان، آپ وہیں ٹھہریں۔" افروز گل کی آواز آئی۔ "میں باہر آ رہا ہوں۔"

پھر دھیرے دھیرے دروازہ کُھلا اور افروز گل کاریز کے دہانے میں آ گیا۔ اُس کے ساتھ کوثر بھی تھی۔ خوف زدہ سہمی ہوئی۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی۔ سر سے اوڑھنی غائب تھی۔ اُس نے سردار بختیار اور شاہ بخت وغیرہ کو دیکھا تو سسک سسک کر رونے لگی۔ یقیناً اس کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ بھاگ کر سردار بختیار کے پاس چلی جائے۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ افروز گل نے اس کی کلائی سختی سے تھام رکھی تھی۔ خود افروز گل کا عجب حال تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی اور چہرہ غصّے کے باعث سیاہ ہو رہا تھا اور جب وہ بولا تو اُس کی آواز سے جنونی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ "بابا جان! آپ وہیں ٹھہریں اور کوئی بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے ورنہ میں کوثر کو گولی مار دوں گا۔"

شاہ بخت نے افروز گل کے سیدھے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پستول کو دیکھا۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعی اس کے سامنے افروز گل کھڑا ہے۔ اس کا اپنا بیٹا۔ مگر افروز گل ایسا تو نہ تھا۔ وہ تو بہت نرم دل اور پیارا لڑکا تھا۔ یہ شخص یقیناً کوئی اور ہے جس نے افروز گل کا روپ دھار رکھا ہے۔ شاہ بخت یوں سوچ رہا تھا جیسے خود کو فریب دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر ان فضول تسلیوں سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ افروز گل واقعی سامنے موجود تھا اور کوثر کی موجودگی اس حقیقت کی غماز تھی کہ وہ تمام الزامات درست ہیں جو سردار بختیار نے لگائے ہیں۔ شاہ بخت نے یکایک خود کو سنبھالا، دل پر پتھر رکھا اور سخت لہجے میں کہا۔

"افروز گل! کیا تم نے ہاشم گل کو قتل کیا ہے؟"

"ہاں، میں نے ہاشم گل کو قتل کیا ہے۔" افروز گل کی آواز میں جنون تھا، غصّہ تھا، لیکن پشیمانی یا خوف بالکل نہیں تھا۔ "اور میں سردار بختیار کو بھی قتل کرنا چاہتا تھا مگر یہ بچ گیا۔ خوش قسمتی ہے اس کی۔ لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ جب بھی موقع ملے گا، اسے بھی قتل کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

"افروز گل!" شاہ بخت نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم نے ایک سنگین جرم کیا ہے۔ مزید حماقت مت کرو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کوثر کو چھوڑ دو اور خود کو ہمارے حوالے کر دو اور . . ."

"نہیں . . . نہیں . . ." افروز گل بات کاٹ کر [illegible]

نہیں کر سکتا [illegible]

[illegible]

گے کہ میں نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟"

"کیوں کیا؟" یہ بات شاہ بخت نے بڑی بے بسی کے انداز میں کہی۔

"کیونکہ بابا جان!" افروز گل ہذیانی انداز میں زور زور سے بولنے لگا۔ "آپ نہیں جانتے کہ سردار بختیار نے کیا کیا تھا، ہاشم گل نے کیا کیا تھا اور سردار سکندر نے کیا کیا تھا لیکن مجھے معلوم ہے۔ میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ بابا جان اور ریشم! تم بھی برسوں پہلے کی وہ قیامت خیز رات یاد کرو جب فیروز گل کو قتل کیا گیا تھا اور بہنا۔ اس کا بے گناہ خون جو میں نے نہیں دیکھا لیکن اس خون کا رنگ تمہاری آنکھوں میں آج بھی زندہ ہوگا۔ وہ خون جس نے بہایا تھا۔ شہباز ڈاکو نے ۔ ۔ ۔" افروز گل چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔

"نہیں، نہیں بابا جان! وہ خون شہباز ڈاکو نے نہیں بہایا تھا۔ شہباز کا اس وقت کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ تو شاید مر چکا تھا اور قاتلوں نے اس کا نام محض اپنے بچاؤ کے لیے استعمال کیا تھا۔ تو پھر قاتل اور سازشی کون تھے بابا جان! قاتل ہاشم گل تھا اور سازشی تھے سردار بختیار اور سردار سکندر ۔ ۔ ۔"

"کیا بک رہے ہو تم؟" سردار بختیار دھاڑ کر چلایا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" افروز گل نفرت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "برسوں تک اس راز پر پردہ پڑا رہا اور برسوں تک تمہارا چہرہ نقاب میں چھپا رہا۔ مگر اب یہ نقاب اٹھ گیا ہے اور میں نے تمہارا مکروہ چہرہ دیکھ لیا ہے۔ تم سازشی اور قاتل ہو اور میں تمہیں تمہارے جرموں کی سزا ضرور دوں گا۔"

"افروز گل! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟" شاہ بخت چیخ کر بولا۔ اس کی آواز سے شدید حیرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ سچ ہے بابا جان! یہ سچ ہے۔" افروز گل بولا۔ "میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ اس سازش میں سردار بختیار، سردار سکندر اور ہاشم گل کے علاوہ فقیر شاہ اور اس کے تین ساتھی بھی شامل تھے۔ قاسم جان، عنایت اور ریاست خان۔ قاسم جان اور عنایت نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ عنایت گڑھی نجیب شاہ میں آج بھی موجود ہے۔ آپ اس سے پوری حقیقت خود معلوم کر سکتے ہیں بابا جان! اس سنگ دل آدمی نے صرف اس لیے انتہائی بے رحمی سے فیروز گل کو قتل کرا دیا تھا تاکہ آپ کی دولت اور جائداد اور قبیلے کی سرداری پر قبضہ کر سکے۔ سنا آپ نے بابا جان! یہ شخص سانپ کی طرح مکار اور زہریلا ہے۔ اس نے کل بھی آپ کو ڈسا تھا اور آئندہ بھی یہ آپ کو نہیں چھوڑے گا۔ مگر اب اسے اس کا موقع نہیں ملے گا۔ فقیر شاہ، ریاست خان، سردار سکندر اور قاسم جان مر چکے۔ ہاشم گل کو میں نے قتل کر دیا اور سردار بختیار کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔ اسے بھی مار ڈالوں گا! اس سے پہلے کہ یہ آپ کو، مجھے یا میرے بچے کو نقصان پہنچائے۔"

شاہ بخت یہ ساری باتیں کچھ اس طرح سن رہا تھا جیسے سکتے کے عالم میں ہو۔ ہکا بکا ۔ ۔ ۔ ۔ بوکھلایا ہوا، حیرت زدہ۔ اس کو کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ فیروز گل کے قتل میں سردار بختیار کا ہاتھ ہو سکتا ہے مگر اب پہلی بار افروز گل اسے اس حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا۔ کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کم از کم افروز گل کے لہجے سے تو نہیں جانا جاتا تھا کہ اس کا یہ دعویٰ جھوٹ ہو سکتا ہے۔ جب افروز گل خاموش ہوا تو شاہ بخت نے چونک کر ہراساں نظروں سے سردار بختیار کی طرف دیکھا اور تیز آواز میں پوچھا۔ "سردار بختیار! کیا یہ سچ ہے؟"

سردار بختیار کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ چند لمحے پہلے جو کرختگی اور غصہ اس کے چہرے پر تھا، اب وہ اڑ چکا تھا۔ اس کی کیفیت وہ تھی جو ایک مجرم کے پکڑے جانے پر ہوتی ہے۔ خجل اور خوف زدہ۔ اس نے شاہ بخت کا سوال سنا تو چلا کر بولا۔ "نہیں ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ یہ بکواس ہے۔ تمہارا بیٹا بالکل جھوٹ بولتا ہے۔" مگر اس کا لہجہ کمزور تھا اور اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"خیر ۔ ۔ ۔ خیر یہ بات بعد میں دیکھی جائے گی۔" شاہ بخت نے کہا۔ پھر وہ افروز گل کی طرف متوجہ ہوا۔ "افروز گل جو کچھ تم نے کہا اگر یہ سچ ہے تو سردار بختیار کا فیصلہ قبیلے کی روایات اور قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن جو کچھ تم نے کیا، اس کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ کوثر کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہارے لیے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟"

"تو پھر تم خود ذمے دار ہو گے۔"

"بابا جان! میں نے ہمیشہ آپ کا حکم مانا ہے۔" قدرے توقف کے بعد افروز گل نے کہا۔ "مگر میں یہ حکم نہیں مان سکتا۔ یہ ایک رواج ہے کہ باپ کے قرضے بیٹا ادا کرتا ہے، اسی طرح باپ کے بدلے لینا بھی بیٹے کا فرض ہوتا ہے۔ اس شخص نے آپ کو بیٹے کی موت کا داغ دیا تھا، میری بیوی کو بیوگی کا دکھ دیا تھا، اس سے بدلہ لینا میری ذمے داری ہے۔ بابا جان! آپ نہیں جانتے کہ میں پچھلے کئی دن سے کیسی آگ میں جل رہا تھا۔ جب بات برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نے عمل کا فیصلہ کیا۔ میں نے ہاشم گل کو قتل کر دیا۔ لیکن میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا۔ میں سردار بختیار کو بھی قتل کروں گا۔ مگر اس سے پہلے میں اس کی عزت کو نیلام پر چڑھاؤں گا۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" سردار بختیار چراغ پا ہو کر چلایا۔

افروز گل ہنسا۔ بڑی زہریلی ہنسی تھی اس کی۔ پھر اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "میں کوثر کو لے جا رہا ہوں۔ اسے بازار میں بٹھاؤں گا جہاں تمہاری عزت اور تمہارا نام مٹی میں مل جائے گا۔ سنا تم نے سردار بختیار! تمہاری عزت بازار میں بکے گی دو دو ٹکوں میں، اور تمہارے گھر کا

کوئی فرد کبھی سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

کالج کے باہر دائیں جانب افروز گل کی جیپ کھڑی تھی۔ افروز گل نے بات ختم کی اور کوثر کو گھسیٹتا ہوا جیپ کی جانب لے جانے لگا۔ کوثر ابھی تک رو رہی تھی۔ افروز گل کی منت سماجت کر رہی تھی لیکن افروز گل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جب وہ جیپ کے قریب پہنچا تو سردار بختیار نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر افروز گل نے معاً زور سے چلا کر کہا۔

"نہیں، سردار بختیار وہیں رک جاؤ، ورنہ میں کوثر کو گولی مار دوں گا۔"

سردار بختیار رک گیا اور بے چارگی کے ساتھ شاہ بخت کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے کسی قدر طنزیہ لہجے میں کہا: "سردار شاہ بخت! کہاں گئی تمہاری خود داری اور تمہارا انصاف۔ کیا تم اسی طرح کھڑے دیکھتے رہو گے اور وہ کوثر کو لے جائے گا؟"

شاہ بخت نے گھوم کر سردار بختیار کو اور پھر سردار مُراد کو دیکھا۔ پھر اس نے زور سے سانس لی اور رائفل اٹھا کر افروز گل کا نشانہ لے کر اونچی آواز میں بولا: "افروز گل! اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو . . ."

"تو آپ مجھے گولی مار دیں گے۔" افروز گل بات کاٹ کر استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "نہیں، بابا جان! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں آپ کا بیٹا ہوں، آپ کی واحد اولاد۔ آپ مجھے گولی نہیں مار سکتے۔" یہ کہہ کر اس نے کوثر کو زبردستی جیپ میں بٹھا دیا اور گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف جانے لگا۔ شاہ بخت نے ایک بار پھر اُسے وارننگ دی اور انگلی ٹرائیگر پر رکھی۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ وہ لمحہ قیامت کا لمحہ ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ پورے بدن میں سنسنی سی ہو رہی تھی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔ واقعی اس وقت وہ تلوار کی دھار پر کھڑا تھا اور تلوار بڑی غیر جانبدار ہوتی ہے۔ وہ کسی رشتے، کسی جذبے کو نہیں جانتی۔ اس کا کام کاٹنا ہے سو کاٹ دیتی ہے۔ شاہ بخت محسوس کر رہا تھا کہ وہ تلوار پر نہیں چل سکے گا۔ اگر کوشش کرے گا تو اس کے پاؤں کٹ جائیں گے۔ اس نے ٹریگر دبانے کی کوشش کی۔ مگر اس کی انگلیاں کانپ گئیں اور ہاتھ بے جان سے ہو گئے۔

ٹھیک اسی وقت اُس نے اپنے کندھے پر ایک ہاتھ کا دباؤ محسوس کیا۔ گھوم کر دیکھا تو ریشم تھی۔ وہ اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی اور اس تمام عرصے میں بالکل خاموش رہی تھی۔ جب شاہ بخت نے اس کی جانب دیکھا تو اُس نے مدھم لیکن پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "بابا جان! رائفل مجھے دے دیجیے۔"

شاہ بخت نے رائفل اُسے دے دی۔

ریشم نے رائفل کا رُخ افروز گل کی جانب کیا اور اونچی آواز میں بولی: "افروز گل! رک جاؤ۔"

افروز گل اس وقت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے لیے پاؤں اُٹھا رہا تھا۔ اُس نے ریشم کی آواز سنی تو چونک کر رک گیا اور حیرت سے بولا: "ریشم تم؟"

"ہاں میں۔" ریشم نے مضبوط لہجے میں کہا: "افروز گل! میں تم سے کہتی ہوں، بابا جان کے حکم کی تعمیل کرو۔ کوثر کو چھوڑ دو اور خود کو بابا جان کے حوالے کر دو ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔"

"تم گولی چلاؤ گی؟" افروز گل نے حیرت آمیز استہزا سے کہا۔ "اور وہ بھی مجھ پر۔ نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں افروز گل ہوں، تمہارا شوہر۔ تم مجھے بہت چاہتی ہو اور تم مجھ پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر سکتیں۔" یہ کہہ کر اس نے پاؤں پھر جیپ میں رکھا مگر اُسے دوسرا پاؤں اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ یکایک گولی چلی، ایک زبردست دھماکا ہوا، ایک چیخ بلند ہوئی اور پھر گہرا جان لیوا سکوت ہر طرف مسلط ہو گیا۔

اب اس واقعے کو برسوں بیت چکے ہیں۔ شاہ بخت اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اُس کے چہرے کی بے شمار جھریوں میں اس کی طویل زندگی کی ان گنت کہانیاں رقم ہیں۔ ان کہانیوں سے بستی کے بہت کم لوگ ہی واقف ہیں، لیکن خود شاہ بخت کو سب کچھ یاد ہے۔ ایک ایک واقعہ، ایک ایک حادثہ۔ ہر چند کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کسی سے بھی کوئی بات نہیں کرتا۔ لیکن اکثر تنہائی میں ان واقعات کو یاد کرتا ہے جو اس کے ساتھ پیش آئے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس نے ایک طویل، ناقابلِ یقین خواب دیکھا ہے اور شاید وہ اپنے اس شبہے کو سچ ہی مان لیتا۔ مگر اس کے خاندانی قبرستان میں دو نئی قبریں موجود ہیں اور جب تک وہ قبریں موجود رہیں گی، تب تک یہ حقیقت بھی زندہ رہے گی کہ اس کی زندگی میں جو کچھ ہوا، سپنا نہیں سچ تھا۔

یہ دونوں قبریں فیروز گل اور افروز گل کی ہیں۔ شاہ بخت کو اپنے بیٹوں کی موت کا دکھ ہے، لیکن اُسے کوئی پچھتاوا نہیں، نہ ہی کسی سے شکایت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریشم نے اس کے ہاتھ سے رائفل لے کر اور افروز گل پر گولی چلا کر نہ صرف انصاف کے تقاضے ہی پورے کیے تھے بلکہ اس کا سر بھی قبیلے کے سامنے جھکنے سے بچا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ریشم کا وقار اب اس کی نظروں میں اور بھی بلند ہو گیا ہے اور وہ اُسے اب پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔